انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

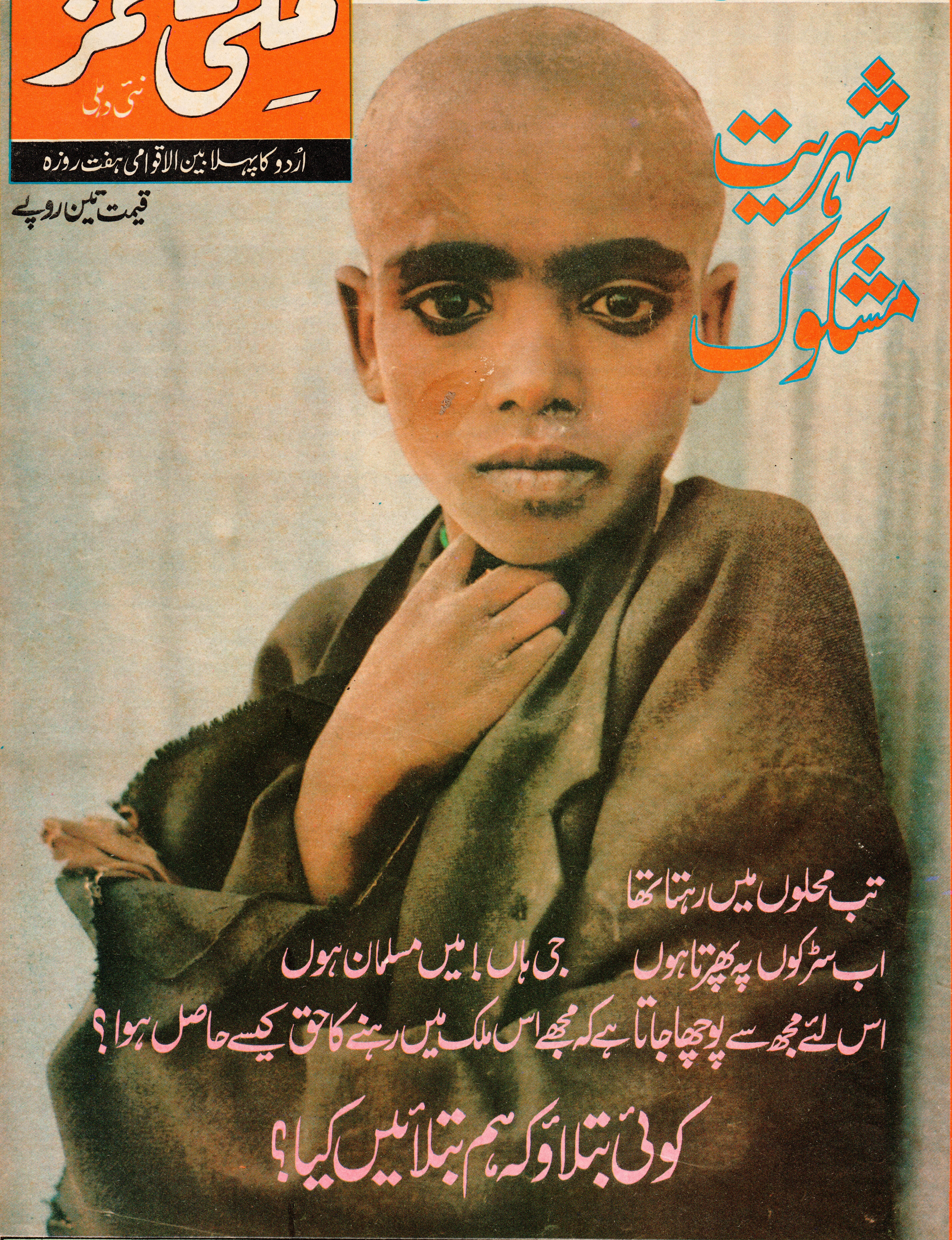
نئی دہلی

اردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

قیمت تین روپے

ہندوستانی مسلمانوں کی

شہریت مشکوک



تب محلوں میں رہتا تھا

اب سڑکوں پہ پھرتا ہوں

جی ہاں! میں مسلمان ہوں

اس لئے مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ مجھے اس ملک میں رہنے کا حق کیسے حاصل ہوا؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

AUSTRALIA	A$3.50	DENMARK	D. KR: 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$4.95	SRI LANKA	Rs40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	£1.30
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$2.50	U.S.A.	US $ 3.00

بین الاقوامی تنظیموں کی اسلام دشمن سرگرمیاں شباب پر

کیا بنگلہ دیش کو فحاشی کا اڈہ بنا دیا جائے گا؟

اسلامی بنیاد پرستی کا قلع قمع کرنے کے بہانے صیہونی سازش کے تحت دنیا کو چار عملی خطوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے مراقش میں اسلام کی سرکوبی کا بیڑہ اٹھایا ہے اور الجیریائی مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ جزیرہ انڈونیشیا میں مسلم کشی کے لئے پرتگالیوں کو مسلط کیا گیا تو وسط ایشیا میں روسی یہ کام کر رہے ہیں۔ برصغیر کے مختلف حصوں میں اسلام کے ابھرتے ہوئے "خطرہ" سے مقابلہ آرائی کے لئے ہندوستان کو تیار کر دیا گیا اپنی خفیہ ایجنسیوں کے اشتراک اور باہمی تعاون سے اسرائیل، برطانیہ اور امریکہ اسلام سے برسرپیکار ہیں اور مشرق وسطی کو میدان کارزار بنائے ہوئے ہیں۔

1981 سے 1993 کے دوران بارہ سال کے عرصے میں بنگلہ دیش میں کافرانہ سرکاری ایجنسیوں نے لٹیروں کی پوری فوج بنا رکھی ہے جو بڑی تنخواہیں، آسائش اور دیگر مراعات پانے والے ادیبوں، شاعروں، وکیلوں، صحافیوں اور حقوق نسواں کے حامیوں پر مشتمل ہے۔ ان کے پاس فیکٹریاں، پرنٹنگ پریس اور پبلشنگ ہاوس تک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 47 فی صد بے روزگار افراد والے ملک بنگلہ دیش میں انہوں نے دو لاکھ اشخاص کو اپنی ملازمت میں لے رکھا ہے اور اپنے متعلقہ ممالک سے ملنے والی مالی امداد سے کہیں زیادہ ان کے وسائل ہیں اور ملک کے مختلف حساس علاقوں میں انہوں نے ترقیاتی مراکز کے نام سے اپنے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔

میدان ثقافت میں اس شیطانی غول نے کافرانہ نظریات کے بیج بوئے ہیں اور زہریلے درخت بھی لگائے ہیں جس کا اولین ثمر انہیں تسلیمہ کی شکل میں ملا ہے اور جیسا کہ غیر ملکی اہم شخصیتوں اور تنظیموں کے نمائندوں کی پر جوش تالیوں کے درمیان ایک نیم سیمناری اجتماع میں ان کے مقامی ایجنٹ نے کہا کہ "نئے خیالات ملا گردی یعنی اسلامی روایات کی جگہ لے رہے ہیں اور زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے تو اگر ہمیں غربت سے تجارت حاصل کرنی ہے تو خود کو بدلنا ہوگا، مذہب کی لعنت سے آزاد ہونا پڑے گا کیونکہ مذہب اور ملا ہمیں روٹی نہیں دیتے"

پورے بنگلہ دیش میں غیر ملکی تنظیموں نے ایک ہزار ایسے ترقی پسند پروفیسروں کا جال پھیلا رکھا ہے جو طلباء اور نوجوانوں کو اسلام سے منقطع ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ملک میں 29 حد درجہ قلیل



بنگلہ دیش میں اسلام مخالف تنظیموں کی پہلی دریافت تسلیمہ نسرین

شاعتی اخبارات ایسے ہیں جن سے نہ تو کوئی آمدنی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی طور ان کے جاری رہنے کا جواز ہے۔ لیکن وہ غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے لئے معلومات کا اہم ذریعہ ہیں۔ ان کے وزیر ان بیشتر بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کے لئے غیر ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی خفیہ ایجنسی ریسرچ اینڈ انالی سس ونگ (Raw) نے چار ہزار سات سو ایجنٹ چھوڑ رکھے ہیں جہاں انہوں نے ہندوستان میں بنے ہوئے اسلحوں کی بھرمار کر رکھی ہے یہاں تک کہ دستی بندوق کی قیمت ایک بڑی مچھلی سے زیادہ ہے۔ اسکنڈی نیویائی بلیو فلمیں بنگالی عنوانات کے ساتھ اور فحش رسائل بھی عام ہیں۔ اسکنڈی نیویا جو فحش لٹریچر کی اشاعت میں سرفہرست ہے ان رسائل سے اس کی سالانہ آمدنی 22 ملین ڈالر ہے۔ اسکنڈی نیویائی تنظیموں کے ذمہ داران بنگلہ دیش میں لگائے "سرمایہ" کی مقدار کو راز میں رکھے ہوئے ہیں اور ڈھاکہ میں ڈچ حکومت کے ترجمان نے اس بات کی تردید کی کہ سویڈن میں گود لئے جانے والے غیر ملکی بچوں کو فحش نگاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب رسائل میں شائع شدہ بچوں کی تصویریں اس کے سامنے کر دی گئیں تو وہ گونگا بن گیا بغلیں جھانکنے۔ رسائل پر پبلشر کا نام بھی موجود تھا اس نے صرف اتنا کہا کہ ہم نے سویڈن میں بچوں کے عریاں لٹریچر پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس کے بعد انگریزی کی کمزوری کا بہانہ کرکے گفتگو نامکمل چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈھاکہ میں بعض سویڈش ذمہ داران بھی اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے کہ وہ اپنے طلباء کو اسلام کے مطالعے کے لئے بنگلہ دیش جیسے جمہوری ملک میں ہی کیوں بھیجتے ہیں، قم، الازہر دمشق مکہ کوالالمپور اور عمان کیوں نہیں بھیجتے۔

سویڈن اور ناروے کی حکومتوں کا خیال ہے کہ بنگلہ دیش کے لئے امدادی کنسورشیم کے پس پردہ وہ بنگلہ دیشی حکومت کو بلیک میل کرتے ہوئے وہ اسلام کش صیہونی منصوبے کی تکمیل کر سکیں گے۔

کئی ذمہ دار بنگلہ دیشی شہریوں کا کہنا ہے کہ ملک میں اسکنڈی نیویائی سفارت کاروں اور غیر ملکی تنظیموں کے ایجنٹ کے روپ میں اسرائیلی موساد کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسکنڈی نیویائی قوم جنسی آزادی کی قائل ہے اور وہاں 51 فیصد بچے اپنے ماں باپ کا نام نہیں بتا سکتے اور یہ بے حیائی ان کے لئے کسی طرح باعث شرم نہیں بلکہ عام سماجی قدر ہے۔ اسی طرح عورتوں اور مردوں کی ہم جنسی اور ان کے درمیان رشتہ ازدواج بھی معمول ہے۔

ماضی میں ایسا ہوا ہے کہ وائی کنگ کہلانے والی اور حیوانی جبلتوں کے علامتی سینگ لگانے والی ایسا قدیم اسکنڈی نیویائی قوم امن پسند برطانوی قوم پر حملہ آور ہوتی رہی۔ اس حملے میں کتنے ہی مرد مار ڈالے جاتے تھے اور ان کی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی جاتی تھی اور بعض دفعہ اس قبیح عمل میں ماں باپ بیٹے اور پوتے ایک ساتھ شامل ہوتے تھے۔ وائی کنگ قوم کے یہی جانشین مسلمان عورتوں کو آزادی دلانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ سلمان رشدی کو بھی وہیں سے غذا مل رہی ہو۔ مسلم دنیا کو اس سوال کے جواب کا انتظار رہے گا کہ تسلیمہ نسرین کو بنگلہ دیش سے اتنی عجلت میں اغوا کیوں کیا گیا۔

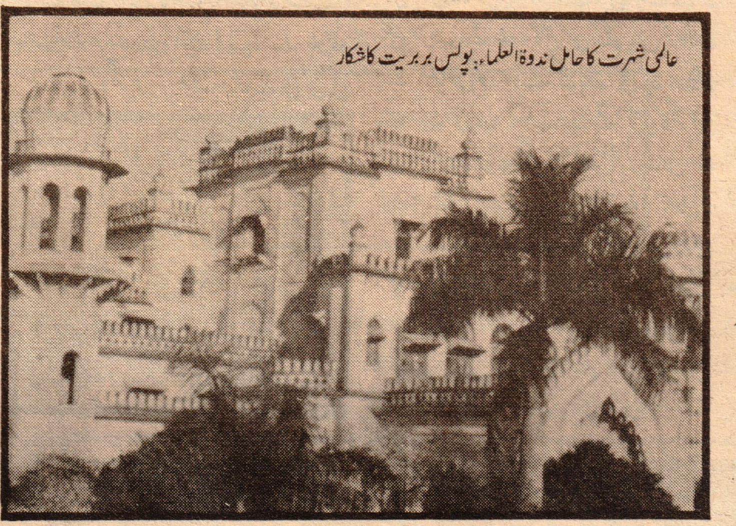
> 47 فیصد بے روزگار افراد والے ملک بنگلہ دیش میں انہوں نے دو لاکھ اشخاص کو اپنی ملازمت میں لے رکھا ہے اور اپنے متعلقہ ممالک سے ملنے والی مالی امداد سے کہیں زیادہ ان کے وسائل ہیں اور ملک کے مختلف حساس علاقوں میں انہوں نے ترقیاتی مراکز کے نام سے اپنے ادارے قائم کر رکھے ہیں انہوں نے ایک ہزار ایسے ترقی پسند پروفیسروں کا جال پھیلا رکھا ہے جو طلباء اور نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔

ندوۃ العلماء پر شب خون

دینی درسگاہوں کی عظمت کو نیست ونابود کرنیکا ناپاک منصوبہ

وہ دن دور نہیں جب اس ملک میں کسی کا خود کو مسلمان بتلانا اور اسلام کا نام لینا بھی ایک جرم تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ حکومت ہند، اس کی پولیس، اس کی خفیہ ایجنسیاں اور انتظامیہ جس طرح حرکت کررہی ہیں اور جس طرح مسلمانوں کو خاص نشانہ بنا کر کبھی ٹاڈا، کبھی آئی ایس آئی اور پاکستانی ایجنٹ تو کبھی بنگلہ دیشی گھس پیٹھئے قرار دے کر انہیں اپنے عتاب کا شکار بنا رہی ہیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس ملک میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو داو پر ہے بلکہ ان کی مذہبی وتعلیمی آزادی اور ان کے بنیادی شہری وانسانی حقوق سبھی کچھ زد پر ہیں۔ ندوہ کا حالیہ واقعہ حکومت ہند کے اس ناپاک منصوبے کا کھلا ثبوت ہے

21 نومبر کی آدھی رات کو دہلی پولیس۔ پی اے سی اور لکھنؤ پولیس، کے ایک بڑے دستے اور مرکزی حکومت کی خفیہ ایجنسی انٹیلی جینس بیورو کے افسران کا ندوہ جیسے عالمی شہرت یافتہ اسلامی تعلیمی ادارے پر حملہ اور ادارے کے ہوسٹل میں سو رہے طلباء کی زدوکوب اور فائرنگ وگرفتاریوں کا عمل اگر کسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے تو یہ کہ اب اس ملک میں اسلامی تعلیمی اداروں اور مسلم نوجوانوں کی خیر نہیں۔ کیونکہ ندوہ جیسا تعلیمی ادارہ جو دنیا میں جامعہ ازہر کے بعد دوسرا بڑا اسلامی تعلیمی ادارہ تصور کیا جاتا ہے اور جنگ آزادی سے لے کر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں جس نے قومی خدمات انجام دینے میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور جس کی قوم پرستی اور حب الوطنی غیر مشروط طور پر سب پر عیاں رہی ہے جب ایسا ادارہ حکومت کی بدنیتی تعصب اور جارحیت کا نشانہ بن سکتا ہے تو بھلا دیگر اداروں کی کیا حیثیت



عالمی شہرت کا حامل ندوۃ العلماء، پولس بربریت کا شکار

ندوۃ العلماء لکھنؤ پر کیا گیا یہ حملہ ایک علامتی حملہ ہے۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو خوف وہراس کی کیفیت میں مبتلا کر کے ان کے حوصلے اور امنگوں کا خون کرنا ہے تاکہ سرکاری تعلیمی اداروں میں ان کے داخلے کو تقریباً مسدود کرنے کے بعد آزادانہ طور پر خالص ملی تعاون کی بنا پر چل رہے تعلیمی اداروں اور درس گاہوں میں جاری ان کی دینی اور تعلیمی وترقیاتی سرگرمیوں پر پابندی عائد کی جاسکے۔ جس سے مسلمانوں کی رہی سہی مذہبی وملی شناخت بھی نہ صرف پامال ہوجائے بلکہ وہ سرچشمہ ہی خشک ہوجائے جس سے اس ملک میں اسلام اور اس کی بقا کو تقویت ملتی ہے۔

ندوہ کو آئی۔ایس۔آئی۔ ایجنٹوں کا اڈہ قرار دے کر ہندوستانی حکومت نہ صرف اس تاریخی اور عالمی اسلامی تعلیمی ادارے کی عظمت کو نیست ونابود کرنے کی سازشیں کر رہی ہے بلکہ تمام دیگر اسلامی اداروں کی تعلیمی وفلاحی سرگرمیوں پر ایک سوالیہ نشان کھینچ کر ان اداروں کے ساتھ ساتھ مسلم طلباء ونوجوانوں کی گردن میں ملک دشمنی اور غداری کا طوق پہنانے کے درپے ہے۔

ایک طرف ندوہ پر چھاپہ مارا گیا اور دوسری طرف دہلی پولس کا کہنا ہے کہ جس خورشید کی تلاش میں یہ قدم اٹھایا گیا تھا وہ ایک مہینہ قبل ہی غازی آباد میں اغوا شدہ غیر ملکی سیاحوں کو چھڑانے کے دوران ہوئی پولس مڈبھیڑ میں مارا جا چکا تھا۔

حملے کے دوران گرفتار شدہ معصوم طلباء کی فوراً رہائی اور ان کے خلاف خفیہ پولیس کے بے بنیاد الزامات وشبہات کا ازالہ، اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ ہماری حکومت اور اس کی ایجینسیاں بے دھڑک ہندوستانی مسلمانوں، اور ان کے اداروں کو بلیک لسٹ کرنے اور انہیں غلط اور فرضی بنیادوں پر زدوکوب کرنے اور انہیں گرفتار کرکے انصاف کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے کبھی ٹاڈا، تو کبھی پولیس مڈبھیڑ تو کبھی ندوہ جیسے حملے کو حربہ بنایا جاتا ہے۔

ندوہ پر حکومت کا حملہ اسلامی حلقوں میں زبردست خوف وہراس اور غم وغصے کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور اسے براہ راست اسلامی تعلیم اور تعلیمی اداروں پر حملہ تصور کیا جارہا ہے۔ ریاستی حکومت کی بروقت مداخلت گرفتار شدہ معصوم طلباء کی فوراً رہائی زخمی طلباء اور ندوہ کی عمارت کو پہنچے نقصان کی تلافی کے لئے ریاستی حکومت کی جانب سے مالی تعاون کے علاوہ مرکزی خفیہ ایجنسی کے ساتھ ملوث مقامی پولیس کے افسران کے خلاف تادیبی کارروائیوں سے گو حالات کو قابو میں کرنے میں مدد ملی ہے لیکن مسلمانوں کے غم وغصے کا مرکز نرسمہاراؤ کی حکومت اور مرکز کی خفیہ ایجنسی انٹلی جینس بیورو ہے۔ جس نے اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ ندوہ میں کوئی دہشت گرد نہ

باقی صـ 14 پر

اسلامی اداروں کو بدنام کرنیکی خطرناک سازش

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

ملک کے قدیم اور معروف ترین اسلامی ادارے ندوۃ العلماء لکھنؤ پر انٹلی جنس اور پولس کے دہشت گردانہ چھاپے کے خلاف پوری مسلمان قوم نے احتجاج کیا ہے۔ اتر پردیش میں تاجروں نے اپنی دکانیں بند رکھیں اور ملک بھر سے مسلم رہنماؤں اور دانشوروں نے اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اسے اسلام اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے براہ راست خطرے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انٹلی جنس بیورو کے ایجنٹوں، دلی پولس کے کمانڈوؤں اور لکھنؤ پولس کے جوانوں پر مشتمل ایک جتھے نے سہ شنبہ 22 نومبر کو صبح کے قریب دارالعلوم ندوۃ العلماء پر چھاپہ مارا۔ چھاپے کے دوران سات طلباء کو گرفتار کیا گیا اور کچھ ہی دیر بعد انہیں رہا بھی کر دیا گیا۔ چھاپہ مار پارٹی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ہوائی فائر بھی کیے جس میں دو طالب علم زخمی ہوئے۔

اس انوکھے چھاپے کی کارروائی کا آغاز پونے دو بجے صبح میں ہوا جب مکمل طور پر مسلح ایک پولس دستہ صوبائی حکام یا ندوہ کی انتظامیہ کو مطلع کیے بغیر زبردستی اطہر ہوسٹل میں داخل ہوا اور تمام دروازوں کو باہر سے بند کرتے ہوئے پہلی منزل پر کمرہ نمبر بیس کی طرف بڑھا۔ پولس پارٹی نے اس کمرے میں مقیم طلباء کو باہر آنے کا حکم دیا۔ طلباء جو کہ سو رہے تھے فوراً حکم کی تعمیل نہ کرسکے تو چھاپہ مار پارٹی نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور طلباء کا سامان اور کمرے میں موجود فرنیچر برباد کر دیا۔ انہوں نے اس کمرے میں پائی گئی کتابوں اور دیگر کاغذات کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔ کمرے میں سات لڑکے رہتے تھے۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس اثناء میں دوسرے طلباء اور اساتذہ جائے وقوع پر جمع ہو چکے تھے اور انہوں نے پولس پارٹی سے دریافت کیا کہ وہ ان سات طالب علموں کو اپنے ساتھ کیوں پکڑ کر لے جارہے ہیں۔ پولس نے اس استفسار کا جواب دینے سے انکار کیا اور فائرنگ کرنے لگے جس میں دو طالب علم زخمی ہوئے۔

گرفتار شدہ سات طالب علم حضرت گنج پولس اسٹیشن لائے گئے جہاں ان سے کئی گھنٹے تک پوچھ تاچھ ہوتی رہی۔ انٹلی جنس بیورو کی ٹیم ان سے ایک کشمیری نوجوان خورشید احمد کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی جو کہا جاتا ہے کہ کمرہ نمبر بیس میں تقریباً چار ماہ پہلے قیام پذیر رہا تھا اور دلی کے قریب چار برطانوی شہریوں کے اغوا کے معاملے میں ماخوذ تھا۔ اتر پردیش کے وزیر اعلی ملائم سنگھ یادو نے فوراً حرکت میں آکر گرفتار طلباء کی رہائی کا انتظام کیا اور صوبائی حکومت کی اجازت حاصل کیے بغیر انٹلی جنس بیورو کی ٹیم کے ساتھ تعاون کے لئے لکھنؤ پولس کے دو افسروں کو معطل کیا۔ وزیر اعلی نے زخمی طالب علم کے لئے معاوضہ کے طور پر دس ہزار اور ہوسٹل کی تباہ شدہ چیزوں کی مرمت کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم منظور کی۔

اس چھاپے کے فوراً بعد ندوۃ العلماء کو چند روز کے لئے بند کرنا پڑا۔ بتایا جاتا ہے کہ انٹلی جنس بیورو کے ایجنٹ گذشتہ دو ہفتوں کے دوران ہوسٹل میں کشمیری طلباء کی موجودگی کی چھان بین کرنے کے لئے دوبار پہلے ہی ندوۃ العلماء کے احاطے میں آچکے تھے۔ اخباری رپورٹوں میں الزام لگایا گیا ہے کہ گیانا کا ایک شہری ابوبکر جو معروف دہشت گرد بھی ہے وہ بھی ندوہ ہوسٹل میں مقیم رہ چکا ہے۔

ندوۃ العلماء کے ایک دیرینہ کارکن کے مطابق اس کارروائی کا مقصد اسلامی تعلیمی اداروں کو بدنام کرنا اور مسلمانوں کو ہراساں کرنا ہے۔ انہوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس پورے معاملے کے پیچھے اسرائیلی اور امریکی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔

ندوۃ العلماء کے ایک دیرینہ کارکن جناب محمود الاظہر نے راقم السطور کو ٹیلی فون پر بتایا کہ اس پوری کاروائی کا مقصد خصوصا اسلامی مذہبی تعلیم کے اداروں کو بدنام کرنا اور عموما مسلمانوں کو ہراساں اور خوف زدہ کرنا ہے۔ انہوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ اس پورے معاملے کے پیچھے اسرائیلی اور امریکی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔ عربی ماہنامہ "الداعی" کے مدیر مولانا نور عالم امینی جو ہندوستان کی اسلامی تعلیم کی عظیم ترین درسگاہ "دارالعلوم دیوبند" میں عرصے سے تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں انہوں نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ مولانا نے ٹیلی فون پر دوران گفتگو یہ بتایا کہ یہ مسلم تعلیمی اداروں کو بدنام کرنے کی سازش ہے اور اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا کہ یہ اسلامی مدارس پاکستان کی فوجی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کی پناہ گاہیں ہیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ پر یہ چھاپہ مسلم تعلیمی اداروں پر اسی قبیل کے حالیہ حملوں کے سلسلوں کی ایک کڑی ہے۔ ابھی چند ہفتے قبل پولس نے دارالعلوم دیوبند سے تین طالب علموں کو آئی ایس آئی کے ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا اور کچھ ہی دیر بعد ان تینوں کو رہا کر دیا گیا۔ اسی طرح ہاپوڑ کے ایک مذہبی تعلیم کے ادارے خادم العلوم سے وابستہ ایک مدرس کو گذشتہ کئی ماہ سے پریشان کیا جا رہا ہے۔ دیوبند کے ایک اسلامی مالیاتی ادارے مسلم فنڈ کے دفتر کی بھی تلاشی لی گئی۔

حالیہ چند مہینوں کے دوران ہندو جنونیوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ اسلامی تعلیم کے ادارے یعنی مدرسے کشمیری دہشت گردوں اور آئی ایس آئی کے ایجنٹوں کو پناہ دے رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند کے گرفتار شدہ طلباء فوراً ہی رہا کر دئے گئے مسلم مخالف جنونیوں کے مریض ذہنوں کے اختراع کردہ مفروضے کو باطل کر رہی ہے۔ مسلم رہنماؤں اور دانشوروں نے پرزور لہجے میں ایسے تمام الزامات کو بے بنیاد گردانا ہے جن کا مقصد اسلامی اداروں کے خود مختار وجود کو ختم کرنے کے لئے زمین ہموار کرنا ہے۔ ●

جنوبی ہند کے مسلمانوں کا عتاب کانگریس کی موت کا اعلان

کرناٹک اور آندھرا میں ووٹوں کی گنتی شروع ہونے سے قبل ہی انتخابی نتائج کی پیش گوئیوں کا بازار گرم ہے۔ بالخصوص قابل لحاظ مسلم آبادی والے حلقوں میں تو کانگریس کی شکست کو یقینی تصور کیا جارہا ہے کیونکہ آندھرا ہو یا کرناٹک دونوں ہی ریاستوں میں کانگریس سے مسلمانوں کی بیزاری کانگریس کی شکست کا کھلا اعلامیہ ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان ریاستوں میں کانگریس سے مسلمانوں کی بیزاری کے اسباب کیا ہیں؟ ظاہر ہے یہ انتخابات 1992 میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد جنوبی ہند میں ہونے والے پہلے انتخابات ہیں۔ اور بابری مسجد کے انہدام میں سنگھ پریوار کے ساتھ ساتھ نرسمہاراو حکومت کا جو رول ہے اس سے پورے ملک کے مسلمان بخوبی واقف ہیں۔ یہی نہیں سنگھ پریوار کی کھلم کھلا مسلم دشمنی اور کانگریس کے پس پردہ مسلم دشمنی کا راز بھی اب مسلمانوں پر پوری طرح فاش ہوچکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب مسلمان خواہ شمال میں ہو یا جنوب میں، مغرب میں ہو یا مشرق میں کانگریس کے اصلی چہرے سے واقف ہوچکا ہے۔ اور اب تک جو مسلمان کانگریس کے لئے ووٹ بینک بنے ہوئے تھے اب وہ بھی کانگریس کو بی جے پی کی صف میں شمار کرنے لگے ہیں۔

چونکہ جنوبی ہند کی ان دونوں ہی ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد قابل لحاظ ہے بلکہ خاصی تعداد میں ایسے انتخابی حلقے ہیں جہاں مسلمان فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان دونوں ریاستوں میں بی جے پی اور کانگریس دونوں کے مقابلے میں جو مضبوط متبادل جماعتیں اور امیدوار تھے قیاس ہے کہ مسلمانوں کی مکمل حمایت انہیں جماعتوں اور امیدواروں کے حق میں رہی ہے۔ سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ گذشتہ سال اترپردیش کے اسمبلی انتخابات میں مسلمانوں نے اپنی جس سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا تھا کرناٹک اور آندھرا پردیش میں بھی اس دفع مسلمانوں نے وہی رویہ اختیار کیا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ان دونوں ہی ریاستوں میں اپنے بلند بانگ دعوے اور فرقہ پرستانہ سازشوں کے باوجود بی جے پی کی انتخابی کامیابیوں کے امکانات خارج از بحث ہیں، کیونکہ انتخابی مہم کے دوران عوامی رویے کا جو رخ دیکھنے کو ملا اس سے یہ بات بالکل عیاں ہوگئی کہ بی جے پی ان ریاستوں میں کوئی قابل ذکر سیاسی قوت نہیں۔ اور یہی بات کانگریس کے لئے پریشان کن بھی ہے۔ کیونکہ شمالی ہند کی کئی ریاستوں میں کوئی مضبوط متبادل نہ ہونے کے سبب بی جے پی کا ہوا کھڑا کرکے کانگریس اقلیتی فرقے بالخصوص مسلمانوں کے ووٹ سمیٹنے میں جو کامیابیاں حاصل کرتی رہی ہے۔ جنوبی ہند کی ان دونوں ریاستوں میں وہ ایسی صورت حال یا مسلمانوں کے ذہنوں پر نفسیاتی خوف طاری کرنے میں ناکام رہی ہے کیونکہ اگر کرناٹک میں جنتا دل ایک مضبوط متبادل کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے تو آندھرا میں تیلگو دیشم پارٹی نرسمہاراو کی قوت کو چیلنج کرنے کے لئے کافی تھی، یہی سبب ہے کہ دونوں ہی ریاستوں میں مسلمانوں کو رجھانے کی کانگریسی چالیں ناکام ہوتی نظر آرہی ہیں۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ خود کرناٹک سے تعلق رکھنے والے اور وہاں کے مسلم حلقوں میں با اثر سمجھے جانے والے کانگریسی رہنما جعفر شریف کی جانب سے رات دن ایک کردینے کے باوجود مسلمانوں کو کانگریس کی طرف رجھانے کی ان کی

> مبصرین کا خیال ہے کہ گذشتہ سال اترپردیش کے اسمبلی انتخابات میں مسلمانوں نے اپنی جس سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا تھا کرناٹک اور آندھرا پردیش میں بھی اس دفعہ مسلمانوں نے وہی رویہ اختیار کیا ہے۔ اور یہ بات کانگریس اور بی جے پی دونوں کے لئے شکست کا اعلامیہ ہے۔

ساری کوششیں رائگاں گئیں۔ کیونکہ قابل لحاظ مسلم آبادی والے حلقوں میں بابری مسجد کے انہدام میں کانگریس کے رول کی صفائی اور کانگریس کے سیکولر ہونے کی دہائی دینے کے باوجود جعفر شریف کے انتخابی جلسوں میں مسلمانوں کی شرکت برائے نام ہی رہی جب کہ کل 224 حلقوں میں سے کرناٹک میں ایسے انتخابی حلقے کی تعداد تقریبا 50 ہے جہاں مسلمان فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان حلقوں میں سوائے 1985 کے انتخابات کے دوسرے تمام انتخابات میں مسلمانوں نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت کی ہے۔ لیکن حالیہ انتخابات میں 1985 کی تاریخ دہرائے جانے کا امکان قوی ہے۔

مسلمانوں کی کانگریس بیزاری اور ان کے بدلتے ہوئے تیور کے پیش نظر کانگریس حلقوں میں کافی کھلبلی کا ماحول پیدا ہوگیا ہے، یہی سبب ہے کہ جعفر شریف کے علاوہ کانگریس کے پاس کرناٹک کے مسلمانوں کو رجھانے کے جتنے بھی پتے ہوسکتے تھے سب اس نے پھینک دیئے تھے۔ یعنی کانگریس میں اہم تصور کئے جانے والے مسلم رہنماؤں مثلا غلام نبی آزاد، محسنہ قدوائی، اور طارق انور سبھوں کو کرناٹک کے مسلم آبادی والے حلقوں میں انتخابی مہم میں کافی مستعدی سے مسلمانوں کو رجھانے کے کام میں لگایا گیا تھا۔ لیکن جعفر شریف سمیت ان تمام کانگریسی مہروں کے سامنے مسلم عوام کا جو سوال تھا وہ یہ کہ بابری مسجد کے انہدام کے مسئلے پر کانگریسی مسلم رہنماؤں نے کیا موقف اختیار کیا تھا؟ اور اگر وہ محض اپنی کرسی کی حفاظت اور ذاتی مفاد کے لئے خاموش تماشائی بنے رہے تو انہیں کیا حق ہے کہ وہ مسلمانوں سے کانگریس کی حمایت کا مطالبہ کریں۔ ظاہر ہے یہ سوالات ان تمام کانگریسی رہنماؤں کے لئے پریشان کن تھے۔ بابری مسجد کے علاوہ ہبلی کا تنازعہ، ٹیلی ویژن پر اردو خبروں کے ٹیلی کاسٹ سے بھڑکے فسادات میں ریاستی و مرکزی حکومت کا رویہ اور ٹاڈا کے تحت مسلمانوں کو بےلگام ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے واقعات وسائل بھی کرناٹک کے مسلمانوں کے ذہنوں میں کوندتے رہے اور ظاہر ہے اس بیزاری کا مظاہرہ ووٹ کی شکل میں بھی ہوا ہوگا۔

جہاں تک آندھرا کا سوال ہے۔ آندھرا میں بھی کانگریس نے مسلمانوں کو رجھانے کی کم کوششیں نہیں کی تھیں۔ ایک طرف جہاں پس ماندہ ذاتوں کی فہرست میں مسلمانوں کو شریک کرنے کے ریاستی حکومت کے اعلان کے ذریعہ ریزرویشن کے نام پر مسلمانوں کے دل جیتنے کی ناکام کوششیں کی گئیں تو دوسری جانب کمال الدین احمد کو ریاستی کانگریس کا صدر نامزد کرکے مسلمانوں پر کانگریس کے سیکولر ہونے کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کرناٹک کی طرح آندھرا میں بھی مسلمانوں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی گئی وہاں بھی مسلمان کانگریس کو اسی پیمانے سے دیکھتے ہیں جس سے کرناٹک کے مسلمان دیکھتے ہیں وہاں بھی کانگریس کی بجائے تیلگو دیشم کی جانب مسلمانوں کا جھکاؤ واضح تھا۔ غرض کہ ان دونوں ریاستوں میں کانگریس سے مسلمانوں کی بیزاری نہ صرف ان ریاستوں میں کانگریس کی شکست کا اعلامیہ ہے بلکہ اس بات کا اشاریہ بھی کہ آنے والے دنوں میں ملک گیر سطح پر کانگریس مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہوگی اور یہ محرومی قومی سطح پر کانگریس کی سیاسی موت کا اعلامیہ ثابت ہوگی۔ ●

کیا راؤ حکومت مرکز میں کانگریس کی آخری حکومت ہوگی؟

جنوبی ہند کی دو اہم ریاستوں یعنی آندھرا پردیش اور کرناٹک میں انتخابات کا عمل تقریبا مکمل ہوچکا ہے۔ اور لوگوں کی نگاہیں ووٹوں کے ان ڈبوں پر جمی ہوئی ہیں جن میں امیدواروں کی قسمت بند ہیں۔ گرچہ ووٹوں کے ڈبوں کے کھلنے اور گنتی کے عمل کی تکمیل سے قبل دونوں ریاستوں میں قسمت آزمائی کر رہی مختلف سیاسی جماعتوں اور ان سے وابستہ وناوابستہ امیدواروں کی قسمت کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن انتخابی مہم کے دوران عوامی رویے اور مختلف سیاسی جماعتوں کی کارکردگی کے پیش نظر سیاسی مبصرین کی جو قیاس آرائیاں ہیں ان میں اس بات پر تقریبا سبھوں کا اتفاق ہے کہ ان دونوں ریاستوں میں کانگریس کی شکست یقینی ہے۔ حیدرآباد اور بنگلور دونوں ہی ریاستی راجدھانیوں میں نتائج کے اعلان سے قبل ہی کانگریسی حلقوں پر نفسیاتی شکست کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس حیدرآباد میں تیلگو دیشم اور بنگلور میں جنتا دل کے خیمے میں نئے جوش خروش کا ماحول طاری ہے۔

آندھرا پردیش اور کرناٹک دونوں ہی ریاستیں ماضی میں کانگریس کا مضبوط قلعہ تصور کی جاتی رہی ہیں۔ آندھرا میں تیلگو دیشم اور کرناٹک میں جنتا دل کے مختصر دور حکومت کو اگر صرف نظر کر دیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں ریاستوں پر آزادی کے بعد سے ہی سیاسی اعتبار سے کانگریس کی اجارہ داری قائم رہی ہے۔ حتی کہ ایمرجنسی کے بعد ہوئے انتخابات میں بھی جب سارے ملک سے کانگریس کا تقریبا صفایا ہوچکا تھا۔ جنوبی ہند کی ریاستوں نے اندرا گاندھی سے اپنی وفاداری کا بھرپور ثبوت دیا تھا۔ علاوہ بریں ماضی قریب یعنی 1991 کے عام انتخابات میں بھی نرسمہاراؤ کا وزارت عظمی کی کرسی پر فائز ہونا اور مرکز میں کانگریسی حکومت کا قیام صرف اور صرف جنوبی ہند کے انتخابی نتائج کے سبب ہی ممکن ہوسکا تھا۔ لیکن حالیہ انتخابات میں ان دونوں ہی ریاستوں میں کانگریس کی شکست کے یقینی امکانات کے پیش نظر ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ان دونوں ہی ریاستوں میں کانگریس کی شکست بالاخر مرکز پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کرے گی کیونکہ تقریبا 18 مہینے بعد ملک میں عام انتخابات ہوں گے اور شمالی ہند کی طرح جنوبی ہند نے بھی اگر کانگریس کو خیرباد کہہ دیا تو یہ کہنا خارج از امکان نہ ہوگا کہ نرسمہاراؤ کی حکومت مرکز میں کانگریس کی آخری حکومت ہوگی۔

جنوبی ہند کی ان دونوں ریاستوں میں کانگریس کی شکست کے قوی امکان کے پیچھے جن باتوں کا دخل ہے ان میں اہم ہیں کانگریس کی غلط پالیسیاں، خواہ وہ سیاسی پالیسیاں ہوں یا معاشی۔ کانگریس دونوں ہی محاذ پر بری طرح ناکام رہی ہے۔ ایک طرف جہاں کانگریس کی متعصبانہ پالیسیوں کے سبب کانگریس کے اندر فرقہ پرست عناصر اور مسلم مخالف قوتوں کا اضافہ ہوا ہے جس سے مسلمانوں کے اندر کانگریس سے بدظنی اور نفرت کے جذبے

> ایک طرف اگر کانگریس کی متعصبانہ پالیسیوں کے سبب مسلمانوں کے اندر کانگریس سے بدظنی اور نفرت کی شدت میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف غلط معاشی پالیسیوں کے نتیجے میں عوامی سطح پر بڑھتی مہنگائی بے روزگاری، کرپشن اور معاشی اصلاح کے نام پر ترقیاتی ناکہ بندی کے سبب کانگریس سے عام بیزاری کے رجحان کو تقویت ملی ہے۔

میں شدت آئی ہے تو دوسری طرف غلط معاشی پالیسیوں کے نتیجے میں عوامی سطح پر بڑھتی مہنگائی بے روزگاری، کرپشن، اور معاشی اصلاح کے نام پر ترقیاتی ناکہ بندی کے سبب کانگریس سے عام بیزاری کے رجحان کو تقویت ملی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انتخابی منشور میں کانگریس کی جانب سے دکھائے گئے سبز باغ کو نہ تو عوام نے کوئی اہمیت دی اور نہ ہی وزیر اعظم نرسمہاراؤ کی جانب سے علاقائی جذبات کو ابھارنے اور اس سے انتخابی فائدے حاصل کرنے کی جی توڑ کوششیں ہی اپنا اثر دکھاتی نظر آرہی ہیں۔

کیونکہ آندھرا پردیش اور کرناٹک دونوں ہی ریاستوں میں انتخابی مہم کے دوران کانگریسی حلقوں اور بالخصوص نرسمہاراؤ کے قریبی حلقوں کی جانب سے معاشی وسیاسی پالیسیوں کی بنا پر ووٹ مانگنے سے زیادہ زور جس بات پر صرف کیا جاتا رہا ہے وہ یہ تھا کہ وزارت عظمی کی کرسی پر نرسمہاراو کا فائز ہونا پورے جنوب کے لئے باعث افتخار ہے۔ اور اگر جنوبی ہند کی ان دونوں ریاستوں میں کانگریس کو فتح حاصل نہ ہوئی تو اس سے پورے جنوب کے افتخار کو دھکا پہنچے گا۔ بالخصوص آندھرا پردیش میں تو کانگریس کے انتخابی پروپیگنڈے کا سارا زور اسی پر صرف ہوا، اور نرسمہاراو کے انتخابی جلسے میں "تیلگو دھرتی کا لعل" اور "تیلگو افتخار" کے نعرے گونجتے رہے۔ لیکن ان دونوں ریاستوں کے عوام نے کانگریس کے ان جذباتی انتخابی حربوں کی گرفت سے کافی حد تک خود کو آزاد رکھا۔ کیونکہ دونوں ہی ریاستوں میں کانگریس کے انتخابی جلسوں میں عوامی شرکت اور عوامی جوش وخروش کا منظر کانگریس کے لئے حوصلہ افزا نہیں تھا۔ خود نرسمہاراو انتخابی جلسے میں عوام کو متاثر کرنے سے قاصر رہے۔ مبصرین کا خیال ہیکہ آندھرا پردیش اور کرناٹک دونوں ہی ریاستوں میں کانگریس کی امکانی شکست کے پیچھے کارفرما اسباب میں ایک اہم سبب کانگریس کی اندرونی رسہ کشی اور تصادم ہے۔ کیونکہ بڑی تعداد میں باغی کانگریسی امیدواروں کی موجودگی بھی کانگریس کے روایتی ووٹ میں تقسیم کا سبب ہوسکتی ہے سابق کانگریسی وزیراعلی کرناٹک میں بنگارپا کی کانگریس سے علاحدگی اور آندھرا پردیش میں کانشی رام کی بہوجن سماج پارٹی کی موجودگی بھی کانگریس کے ووٹ بینک میں ہی نقب زنی سے عبارت ہے۔ لہذا کانگریس کے لئے جنوب میں سیاسی بساط تنگ ہوتی نظر آرہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ووٹوں کی گنتی کیا گل کھلاتی ہے، اور انتخابی مہم کے دوران عوامی رجحان اور رویے کی جو جھلک دونوں ریاستوں میں دکھائی دے رہی تھی اس کی ترجمانی ووٹوں کے نتائج کی شکل میں کس طرح سامنے آتی ہے۔ ●

”ملی پارلیامنٹ اگر ملت کے اندر کسی نئی شناخت کی کوشش معلوم ہوئی تو

ہم ملی پارلیامنٹ کو تحلیل کر دیں گے“

قائد ملی پارلیامنٹ

گزشتہ ہفتہ علی گڑھ میں واقع ملی پارلیامنٹ کے مرکزی دفتر میں بڑی چہل پہل رہی۔ ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مہمان، ملی پارلیامنٹ کے متوسلین اور اعلیٰ عہدیداران در اصل ایک ہفتے کے تربیتی اور مشاورتی کیمپ میں شرکت کے لئے آئے تھے جس کا مقصد اپنی اصلاح و تربیت کے علاوہ ملی پارلیامنٹ کے اب تک کے کاموں کا جائزہ لینا اور مستقبل کے لئے ایک مؤثر لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ ایک ہفتے پر مشتمل یہ اجلاس جو 13 نومبر سے شروع ہو کر 19 نومبر تک مختلف انداز سے جاری رہا اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو پایا اس بارے میں کوئی حتمی بات تو کہنا مشکل ہے البتہ مندوبین کا یہ عام احساس تھا کہ انہیں ہفتے بھر کے قیام سے بہت کچھ حاصل ہوا ہے اور مختلف انداز سے فکر و عمل کے نئے راستے دکھائی دیے ہیں۔ آخری نشست میں جس میں لوگوں کو اپنا تاثر پیش کرنا تھا شرکاء کی آنکھیں نم پائی گئیں

اس سات روزہ کیمپ کی آخری نشست میں جس میں لوگوں کو اپنا تاثر پیش کرنا تھا۔ شرکاء کی آنکھیں نم پائی گئیں اور بعض لوگ تو شدت جذبات میں آکر رونے لگے۔ انہیں شاید اس بات کا شدید احساس تھا کہ ملی پارلیامنٹ کے انقلابی مشن کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر انہوں نے کتنی ذمہ داری قبول کی ہے۔

اور بعض لوگ تو شدت جذبات میں آکر رونے لگے۔ انہیں شاید اس بات کا شدید احساس تھا کہ ملی پارلیامنٹ کے انقلابی مشن کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر انہوں نے کتنی بڑی ذمہ داری قبول کی ہے۔

اس سات روزہ تربیتی اور مشاورتی حلقے میں تقریباً ہر مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کی گئی اور ہر مسئلے پر الگ الگ شرکاء نے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں تبادلہ خیال کے بعد مسائل کے حل کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کیا۔ پہلے دن غلبہ اسلام کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی اور کوشش کی گئی کہ انقلابی مشن کے متوسلین ایک مؤثر لائحہ عمل کی ترتیب و تشکیل کے بعد اس پر متفق ہو سکیں۔

دوسرے دن ملی مفاد اور ملکی مفاد کے تعین کی کوشش کی گئی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں امت الامیہ کے مفادات کیا کیا ہیں اور ان کے حصول کے لئے امت کو کیا کچھ کرنا ہوگا۔ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا گیا ان قوتوں کی نشاندہی کی گئی جو اسلام کی مخالفت میں کام کر رہی ہیں اور جن کا مؤثر تدارک کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس بارے میں شرکاء مختلف گروہوں نے اپنی اپنی اسٹریٹجی بھی تشکیل دی جسے بعد میں مشترکہ غور و فکر کا موضوع بنایا گیا۔

بابری مسجد کے مسئلے پر مباحثے کے دوران اکثر شرکاء کا خیال ہے کہ اس مسئلے کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی امت کو اس پر اپنی ساری توجہ صرف کرنی چاہئے۔ اس بارے میں ایک

باقی صـ ۱۲ پر

ضروری وضاحت

ملی ٹائمز انٹرنیشنل کے گذشتہ شمارے میں قائد ملی پارلیامنٹ کی پریس کانفرنس کی تصویر کی جگہ غلطی سے ایک پرانی تصویر شائع ہو گئی ہے۔ جسے پریس کانفرنس کا ایک منظر کہنا صحیح نہیں ہے۔ ادارہ اس سہو کے لئے معذرت خواہ ہے۔

ملی پارلیامنٹ کے اعلیٰ سطحی اجلاس کیلئے جاری کردہ دعوت نامے کا متن

دستاویز

برادر گرامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

ملی پارلیامنٹ کے تربیتی و مشاورتی حلقہ 1 میں شرکت کا ارادہ مبارک ہو۔ خدا کرے آپ کی شرکت اور ہم لوگوں کا باہم مل بیٹھنا اللہ کے نزدیک بھی قبولیت اختیار کر لے اور ان سات دنوں پر مشتمل اس حلقے سے امت مسلمہ ہند کے لئے ایک ایسی راہ دریافت ہو سکے جس پر چلنا دنیا و آخرت میں فلاح کا ضامن ہو۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اس پروگرام میں شرکت کے لئے ملک کے مختلف صوبوں سے ہم نے صرف مخصوص لوگوں کو ہی دعوت دی ہے اور صرف ان لوگوں کا انتخاب کیا ہے جنہوں نے ہندوستان میں ایک نئی خوش آئند تبدیلی کے سلسلے میں اپنی بھرپور وابستگی کا اظہار کیا ہے اور اس راہ میں پیش آنے والے خطرات کے استقبال کے لئے بخوشی آمادہ ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کے انتخاب سے آپ پر بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے کہ آپ کو انقلابی کارواں میں ہراول دستے کا کام انجام دینا ہے۔

ملک کی موجودہ صورت حال میں بعض مسائل ہمیں ہر لمحہ نئے انداز سے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کا تعین کرنے سے قبل یا کسی واضح اسٹریٹجی کو تشکیل دینے سے پہلے بعض سوالات کے جوابات حاصل کرنا بھی ضروری ہوں گے۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ متعین کرنا ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا نیشنل انٹرسٹ کیا ہے۔ ثانیاً حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کی روشنی میں اس ملک میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کی حیثیت سے ہم اپنے لئے کیسا مستقبل پسند کرتے ہیں۔ ثالثاً ہمیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ اپنی پسند کے مستقبل کے لئے ہمیں کون سا کام کرنا لازم ہوگا اور کن کاموں سے اپنی توجہ ہٹانی ہوگی۔ رابعاً اس بات کا تعین بھی ضروری ہوگا کہ اپنی پسند کے مستقبل کے لئے ہم مطلوبہ قربانیوں کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں۔ پھر غور و فکر کے ان تمام مراحل میں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ ہمارا مجوزہ پسندیدہ مستقبل اپنے دماغ کی اپج نہ ہو بلکہ اس کا براہ راست تعلق کتاب و سنت کے مطلوبہ مستقبل سے لازماً میل کھاتا ہو۔ کہ جب تک بعض بنیادی مسائل کے سلسلے میں ہمارے ذہن و قلب سے ابہام کی گرد نہیں ہٹتی امت کو راہ دکھانے والوں پر خود منزل کے نشانات واضح نہیں ہو سکتے۔ کجا کہ وہ امت کی رہنمائی کا کام انجام دے سکیں۔

ملی پارلیامنٹ کے قیام کے پیچھے در اصل یہی روح کارفرما ہے کہ ہم امت کے کارواں کو ایک انبیائی انقلابی راہ پر گامزن کر دینا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماضی میں بعض کوششوں کے بڑے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے لیکن جس نوع کی تبدیلی ہمارے پیش نظر ہے اس کی روشنی میں ہمیں اس بات کا شدت سے احساس رہا ہے کہ ہم اب تک در حقیقت کچھ بھی نہیں کر پائے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب تک کی تمام کاوشیں در اصل کام کے آغاز سے پہلے کی تیاری تھی۔ پھر ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ انقلابی مشن کو جس کمال احتیاط کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہوتی ہے اس سلسلے میں ہم سے بھی سستی اور لغزش کا ارتکاب ہوتا رہا ہے۔ پھر ملک میں تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی فضا اور ہر لمحہ تغیر پذیر عالمی منظر نامے نے کوئی بھی کوشش نقص سے خالی نہیں ہوتی لہٰذا اپنے لائحہ عمل پر ہر لمحہ غور کرتے رہنا چاہئے اور اسے حالات کی تبدیلی کے ساتھ کتاب و سنت سے روشنی حاصل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانا چاہئے۔ علی گڑھ کے اس مجوزہ حلقے کا ایک پہلو یہ بھی ہوگا کہ ہم اپنے ماضی کی سرگرمیوں کا انتہائی سخت احتساب کرنے کے بعد مستقبل کے لئے نئے اور بہتر خطوط کا تعین کر سکیں گے۔

ہم میں سے ہر شخص خواہ کتنا ہی علامہ کیوں نہ ہو اس کے لئے عام آدمیوں سے سیکھنے کے لئے بہت کچھ باقی ہے اور دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس سے ہمارے لئے کچھ سیکھنا ممکن نہ ہو۔ باہمی استفادہ، ایک دوسرے سے سیکھنے اور سکھانے کا جذبہ، اپنے بھائی کی لغزش پر ادارانہ اور ناصحانہ خیر خواہی کے تحت اس کی گرفت اور اپنی خامیوں کے بارے میں ادراک حاصل کرنا اور اس کے

ازالہ کے لئے ہر لمحہ کوشش کرنا در اصل یہی وہ مثبت جذبات ہوں گے جن کا اظہار انشاء اللہ آپ کو ان سات دنوں میں نظر آئیگا۔

یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے کہ ہم بحیثیت امت اس ملک میں بلکہ پوری دنیا میں ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اگر ہمیں دنیا کی سب سے بڑی سیاسی اور عسکری قوت سے مقابلہ درپیش ہے، تو خود اس ملک میں اس خطے کی سب سے بڑی قوت یعنی ہندوستان کی موجودہ حکومت اور اس کے متعصب باشندوں کا منظم اور مربوط کردہ مسلح اور تربیت یافتہ ہندو پولس، منظم معاشی سرکاری اداروں اور ہمارے وجود کو سرے سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ ہمیں ایک ایسی زندگی جینے پر اصرار کرتے ہیں جو کم از کم اس امت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی جس کے پاس خدا کا آخری پیغام انسانیت کے لئے موجود ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے بعض مسائل ہنگامی بنیادوں پر توجہ چاہتے ہیں۔ ملی پارلیامنٹ ان امور کی طرف نشاندہی کرتی رہی ہے اور اسی لئے ماضی میں ہر موڑ پر ہم نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ ہماری سرگرمیاں امت کی بحیثیت مجموعی نمائندگی کر سکیں اور اس کے فکر و عمل پر کسی خاص مسلک، گروہ کی چھاپ نظر نہ آئے۔

گو کہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ امت کے اندر دین کی تفہیم کے مختلف انداز پائے جانے چاہئیں کہ ایسا فطری ہے البتہ ہم کسی مخصوص تشریح و تعبیر کی بنیادوں پر گروہ بندی کے عمل کو امت کے لئے سخت نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اس ایک ہفتے کے پروگرام میں ہم بھی اسی رویے پر عامل ہوں گے اور آپ سے بھی توقع کریں گے کہ اجتماعی فکر کی تشکیل میں مسالک اور گروہ بندی کو داخل نہ ہونے دیں۔ یاد رکھئے ہم صرف اور صرف مسلمان ہیں ہمارا عقیدہ ضروری اور بنیادی عقیدہ صرف اور صرف وہی ہے جو خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ تھا۔ نہ اس سے ایک انچ کم اور نہ زیادہ۔ اور جب ہم اس عظیم نبی کے ایک معمولی پیروکار کی حیثیت سے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور اس کے عہد سے اس حد تک قریب کر لیتے ہیں تو ہمارے لئے یہ بحث بے معنی ہو جاتی ہے کہ ہم حنفی ہیں یا شافعی، سنی ہیں یا شیعہ، بریلوی ہیں یا دیوبندی، وہابی ہیں یا کچھ اور۔ کہ ہمارا عظیم رسول خدا کا آخری پیغمبر، فدا ہوں جس پر میرے ماں باپ ان تمام تہمتوں سے آزاد تھا۔ اور ہماری حیثیت اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کہ ہم اس عظیم نبی کے انتہائی معمولی پیروکار ہیں۔ یہی وہ رویہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر اس ملک میں ہماری قوت بیس کروڑ ہو جاتی ہے ورنہ اگر ہمارے دماغ محض قبائلی، جماعتی اور مسلکی تعصبات سے پاک نہیں ہوتے تو ہم گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ہماری قوت محدود ہو جاتی ہے۔ کہ ہماری جماعت و مسلک کے لوگ اس ملک میں چند لاکھ چند ہزار یا چند سو ہیں۔ بقیہ امت کو ہم اپنے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں اور ہم بزعم خود چھوٹے چھوٹے گرہوں میں پوری پوری خلافتیں اور امارتیں چلا رہے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم دشمن کے لئے نوالہ تر ثابت ہوتے ہیں، آنے والا ہر دن ہماری تباہی کا ایک نیا باب ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا تنگ دماغ امت کے وسیع مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ خدارا اپنی اس کمزوری کو سمجھئے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان ہونے پر اصرار کیجئے۔ آپ کو کسی اور شناخت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب سب سے بڑی شناخت یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو ہونے کا فخر آپ کو حاصل ہے۔

ملی پارلیامنٹ اگر اس ملک میں انقلاب کی کوئی صبح برپا کر سکتی ہے تو در اصل اس کی امید اسی رویے میں پنہاں ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس رویے کے عملی خد و خال متعین کریں۔ دنیا کی فتنہ سامانیوں، کفر کی عالمی اور مقامی سازشوں سے باخبر ہوں اور اس ملک میں ایک نئے انقلاب کی صبح کے لئے جٹ جائیں۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ سنگین صورت حال سے نکلنے کے لئے ہمارے دل و دماغ پر واضح راستوں کی نشاندہی کر دے۔ اس راہ میں استقامت اور اپنی ساری صلاحیتوں کو قربان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ خدا کرے حسب پروگرام آپ کی علیگڑھ میں تشریف آوری یقینی ہو۔

والسلام

آپ کا بھائی

راشد شاذ

جزیرہ عرب کی سیاست میں امریکی مداخلت اور پیسوں کی ادائیگی کے مسئلے پر

امریکہ کو سعودی عرب کا ٹکا سا جواب

اکتوبر کے اواخر اور نومبر کے آغاز میں مغربی ایشیا میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے اثرات بڑے دوررس ہوسکتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں ہندوستانی پریس نے ان خبروں کو اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ یہ واقعات ایسے تھے جنہیں ان کی اہمیت کے پیش نظر ابھار کرنے کی ضرورت تھی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ پچھلے دنوں سعودی عرب نے بعض اہم امور سے متعلق کئی امریکی درخواستوں کو رد کردیا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ریاض نے امریکی دباؤ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جسے ایک عام ذہن آسانی سے قبول نہیں کرے گا کیونکہ سعودی عرب کے امریکہ سے خصوصی تعلقات ہیں۔

لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ سعودی عرب نے بعض امور میں امریکی دباؤ کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ اکتوبر میں صدام حسین کی فوجوں کے کویتی سرحد پر اجتماع سے جو بحران پیدا ہوا تھا اور جس کے مقابلہ کے لئے امریکہ کو اپنی فوجیں لانی پڑی تھیں، اس پر جو صرفہ آیا ہے امریکہ کو امید تھی کہ سعودی عرب اس کا بڑا حصہ ادا کرے گا، امریکہ نے بارہا اس ضمن میں سعودی عرب سے درخواست بھی کی مگر ریاض نے پہلی بار اس کی بات یا درخواست ماننے سے انکار کردیا۔ ریاض کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ صرف اتنا ہی پیسہ ادا کرے گا جتنا خلیج تعاون کونسل کے ایک ممبر ہونے کے ناطے اس پر واجب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب نے یہ بھی کہا کہ چونکہ مغربی یوروپ اور جاپان اپنے ایندھن کے لئے اس خطے پر منحصر ہیں اس لئے اس علاقے کی حفاظت کی کم از کم مالی ذمہ داری ان پر بھی عائد ہوتی ہے۔

امریکا کا کہنا ہے کہ اس کی فوجوں پر حالیہ عراق کویت بحران کے درمیان جو صرفہ آیا ہے اسکو سعودی عرب ادا کرے۔ ادھر امریکا یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ خلیجی ممالک میں ایک فوجی برگیڈ کا سازوسامان بھی رکھے۔ لیکن سعودی عرب نے دونوں مطالبات کو مسترد کردیا ہے۔۔

اس کے ساتھ سعودی عرب نے امریکہ کی ایک دوسری درخواست بھی رد کردی ہے۔ جنگ خلیج کے بعد امریکہ نے یہ تجویز رکھی تھی کہ خلیجی ممالک کی حفاظت کے لئے اسے ان ممالک میں اپنی مستقل فوج رکھنے کے بجائے ایک دوسری حکمت عملی پر عمل کرنے کا اختیار ملنا چاہئے۔ اس حکمت عملی کے مطابق بعض خلیجی ممالک میں امریکہ تقریبا اتنا فوجی ساز وسامان رکھے گا جو ایک بریگیڈ کے لئے کافی ہو۔ اور جب کوئی بحران پیدا ہوگا تو امریکی فوجیں تیزی سے ہوائی جہازوں کے ذریعے ان ممالک میں اتار دی جائیں گی اور وہاں پہلے سے موجود ہتھیاروں سے اس طرح جڑ جائیں گی جیسے وہ برسوں سے انہیں استعمال کرتی رہی ہیں۔ ابھی حالیہ بحران کے دوران امریکہ نے کویت میں اس حکمت عملی کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس کامیابی سے خوش ہوکر امریکہ نے دوسرے خلیجی ممالک سے بھی ایسے ہی انتظامات پر عمل پیرا ہونے کی درخواست کی۔ قطر نے یہ تجویز فورا قبول کرلی۔ مگر سعودی عرب جہاں پہلے ہی امریکی لڑا کا جہازوں کے کئی اسکویڈرن موجود ہیں، نے اس امریکی درخواست کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ ممکن ہے اب متحدہ عرب امارات اپنے یہاں امریکہ کو اس "انتظام" کے لئے سہولتیں فراہم کرنے پر راضی ہوجائے۔

سعودی عرب اس امریکی فوجی تجویز یا حکمت عملی کا مخالف ہے جو اس نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے "دفاع" کے لئے تیار کی ہے۔ سعودی عرب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خلیجی ممالک کو دوسرے علاقوں اور ممالک سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے۔ مزید برآں ریاض کو اس بات کی بھی تشویش ہے کہ امریکہ اس علاقے کے لئے جو حکمت عملی بھی تیار کرتا ہے اس میں اسرائیل کے مفادات کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ سعودی عرب نے دوسرے خلیجی ممالک کے ساتھ ان مغربی کمپنیوں کا بائیکاٹ ختم کردیا ہے جو اسرائیل سے تجارت کرتی ہیں مگر اس کے باوجود وہ ابھی اسرائیل سے پورے طور پر کھلی تجارت کے لئے تیار نہیں ہے۔ امریکی دباؤ میں زیادہ سے زیادہ خلیجی ممالک شاید اسرائیل سے اردن کے ذریعہ تجارت پر آمادہ ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب نے مراکش میں منعقد ہوئی حالیہ معاشی تعاون کانفرنس میں اس امریکی تجویز کو رد کردیا جس کے مطابق ایک نئے بینک کا قیام عمل میں آنا تھا جو مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں معاشی تعاون کو فروغ دیتا۔ ظاہر ہے اس اسکیم کے تحت امریکہ اسرائیل اور امیر خلیجی ممالک کے مابین براہ راست تجارت کو بڑھانا چاہتا تھا۔ جو اس مرحلے پر سعودی عرب کو قابل قبول نہیں ہے، اس لئے اس نے کھل کر اس اسکیم کی مخالفت کی۔

سعودی عرب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خلیجی ممالک کو دوسرے علاقوں اور ممالک سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے۔ اس کو اس بات کی بھی تشویش ہے کہ امریکا اس علاقہ کے لئے جو حکمت عملی تیار کرتا ہے اس میں اسرائیلی مفادات کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔۔

سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک کو اب یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ اپنے خطے کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی ہے۔ عراق اور ایران دونوں کی اپنی حماقتیں ہیں، اور دونوں ہی کی بعض پالیسیوں اور اقدامات نے علاقے میں بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کی ہے، مگر ان سب کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ وہ جغرافیائی طور پر اسی علاقے میں موجود ہیں اور اس طرح خلیجی ممالک کے مستقل پڑوسی ہیں جنہیں کسی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا چنانچہ بعض تلخ تجربوں کو بھول کر ایک دوسرے کے معاملات میں عدم مداخلت کی بنیاد پر ایک ایسا علاقائی اتحاد قائم ہوجانا چاہئے جس سے ایک دوسرے پر حملے کے امکانات ختم ہوجائیں۔ کیونکہ علاقے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے سے صرف باہری طاقتوں کو مداخلت اور فوائد کے مواقع ملتے ہیں۔ ●

کیا خلیجی تعاون کونسل نے اسرائیل کے قدموں میں اپنا معاشی ہتھیار ڈال دیا؟

حال میں خلیجی تعاون کونسل نے امریکی دباؤ کے تحت اسرائیل کے دوسرے اور تیسرے درجے کے بائیکاٹ کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کی تشریح یوں کی گئی کہ خارجی ممالک کی ان کمپنیوں کا بائیکاٹ ختم کیا جارہا ہے جو اسرائیل سے محدود پیمانے پر تعاون کرتی ہیں۔

حالت جنگ ہو یا حالت امن بعض حکومتیں دوسری حکومتوں کا بائیکاٹ کرتی رہتی ہیں۔ مثلا امریکہ نے کیوبا کا بائیکاٹ کر رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ امریکہ میں کیوبا کے بنے ہوئے سگار تک نہیں خرید سکتے۔

اسرائیل کا عرب بائیکاٹ دراصل 1946 میں شروع ہوا یعنی اس ملک کے قیام سے تقریبا 2 برس پہلے جب عرب لیگ نے ان یہودیوں اور دوسرے تاجروں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا جو ایک یہودی ریاست کے تصور کی حمایت کررہے تھے جس کا واضح مطلب فلسطینیوں کو ان کے گھر سے نکال باہر کرنا تھا۔ دو برس بعد 1948 میں یہ بائیکاٹ اسرائیل کے بائیکاٹ میں تبدیل ہوگیا۔ 1951 میں عرب لیگ نے ان کمپنیوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا جو اسرائیل سے تجارت کرتی تھیں۔ اسے (Secondary) یا دوسرے درجے کا بائیکاٹ کہا گیا۔ اسی کے ساتھ ان اداروں کے بائیکاٹ کا بھی فیصلہ کیا گیا جو سکنڈری کمپنیوں سے تجارت میں مشغول تھیں اسے تیسرے درجے کا یا (Tertiary) بائیکاٹ کا نام دیا گیا۔

اسرائیل کا عرب بائیکاٹ دراصل ایک قسم کا معاشی ہتھیار تھا۔ اسرائیل سے تجارت کرنے والی کمپنیوں کے خلاف بائیکاٹ اس لئے عائد کیا گیا کہ وہ یہودی ریاست کی فوجی طاقت کو کسی نہ کسی درجے میں مضبوط کررہی تھیں۔ اس امداد اور تعاون کی مختلف شکلیں ممکن تھیں۔ مثلا براہ راست ہتھیاروں کی سپلائی یا فنڈ کی فراہمی جس سے اسرائیل ہتھیار خرید سکے۔ بہرحال یہ بائیکاٹ محض ایک قسم کا معاشی ہتھیار تھا۔ اس کی بنیاد مذہب پر نہیں رکھی گئی تھی۔ چنانچہ کسی ایسی کمپنی کا بائیکاٹ نہیں کیا گیا جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کی ملکیت تھی۔ کسی کا محض اس بنیاد پر بھی بائیکاٹ نہیں کیا گیا کہ وہ یہودی ہے بلکہ صرف ان کمپنیوں کا بائیکاٹ کیا گیا جو براہ راست یا بالواسطہ اسرائیل سے فوجی نوعیت کا تعاون کررہی تھیں۔ ایسی یہودی کمپنیاں جن کے اسرائیل سے ایسے معاشی تعلقات نہ تھے جن سے اسرائیل کی فوجی مدد ہوتی ان کا بائیکاٹ نہیں کیا گیا اور ان کی تجارت عربوں سے ہمیشہ ہوتی رہی۔

اسرائیل کے عرب بائیکاٹ کے جواب میں امریکہ کی یہودی لابی نے بھی ایک قانون پاس کروایا تھا جو ابھی تک نافذ العمل ہے۔ لیکن اس کی موجودگی کے باوجود خلیجی تعاون کونسل نے امریکی دباؤ قبول کرکے اسرائیل کے دوسرے اور تیسرے درجے کے معاشی بائیکاٹ کا فیصلہ کرلیا ہے۔

اسرائیل کے عرب بائیکاٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عرب لیگ نے دمشق میں باقاعدہ ایک سیل قائم کررکھا ہے گذشتہ ستمبر 1994 میں اپنی ایک میٹنگ میں عرب لیگ نے اسرائیل کے بائیکاٹ کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر مصر پہلے ہی سے اس پر عمل پیرا نہیں تھا۔ دراصل اب تک صرف مصر ہی ایسا عرب ملک ہے جس کے اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد سے تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ اور اب خلیج کے ممالک بھی اس فہرست میں شامل ہونے کے لئے یا تو بے چین ہیں یا مجبور کئے جارہے ہیں۔ اسرائیل چیمبر آف کامرس کے صدر نے حال ہی میں دعوی کیا تھا کہ عربوں کا اسرائیلی بائیکاٹ ختم ہونے کو ہے۔ ان کے بقول عرب بائیکاٹ کی وجہ سے پچھلے 45 سالوں میں اسرائیل کو 40 بلین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

اسرائیل کے عرب بائیکاٹ کا جواب دینے کے لئے واشنگٹن میں موجود یہودی لابی نے بہت پہلے ایک عرب مخالف قانون بنوایا تھا۔ شروع میں تو ان کی کوشش یہ تھی کہ امریکہ عربوں سے ہر قسم کی تجارت پر پابندی عائد کردے مگر چونکہ بعض طاقتور ممبران سینٹ اس کے مخالف تھے۔ اس لئے ایک ذرا نرم قانون بنایا گیا جس کے مطابق تمام عربوں سے تجارت کا مکمل بائیکاٹ ممکن نہیں ہے۔ بہرحال قانون کیسا ہے اس سے یہاں بحث نہیں ہے۔ بحث اس بات سے ہے کہ یہ قانون ابھی تک نافذ العمل ہے مگر خلیجی ممالک نے اس کی موجودگی میں تعجب خیز طور پر اسرائیل کا بائیکاٹ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بائیکاٹ کی اجازت بین الاقوامی قوانین میں موجود ہے یہی وجہ ہے کہ یہ بائیکاٹ سربوں، عراق اور کیوبا کے خلاف کسی نہ کسی درجے میں قائم ہے۔ امریکہ تو بعض ان جہازوں کو جو کیوبا ہوکر آتے ہیں اپنے پورٹوں پر سامان اتارنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

اسرائیل کے عرب بائیکاٹ کا مقصد پرامن طور پر ریاست کے خلاف معاشی ہتھیار استعمال کرنا تھا کیونکہ اس دہشت گرد یہودی مملکت نے ہزاروں فلسطینیوں کو بے گھر کرکے ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد عرب علاقوں پر قبضہ کرتا رہا۔ اگرچہ آج مصر کے علاوہ اردن نے بھی اسرائیل سے امن معاہدہ کرلیا ہے اور پی ایل او سے بھی اسرائیل کے مصالحانہ تعلقات ہیں۔ لیکن ابھی بھی بہت سارے عرب علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔ اس صورتحال کی موجودگی میں خلیجی تعاون کونسل کا اسرائیل کے بائیکاٹ کو ختم کرنے کا فیصلہ ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے۔ ●

نظریہ خلافت کی مقبولیت سے مغربی ایوانوں میں زلزلہ

برطانوی دانش گاہوں کے دروازے "حزب التحریر" کی سرگرمیوں کے لیے بند

حزب التحریر جسکی ابتداء مصر سے ہوئی، اب ایک عالمی اسلامی انقلابی تحریک بنتی جا رہی ہے۔ حال ہی میں اس نے لندن میں ایک خلافت کانفرنس منعقد کی تھی جس میں 10 ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی تھی۔ مقررین اور بعض شرکاء برطانیہ کے باہر سے ربھی آئے تھے مگر اکثریت برطانیہ میں پڑھنے والے طلبہ اور دوسرے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ لندن میں اتنی بڑی کانفرنس کا انعقاد بذات خود ایک اہم واقعہ تھا جس پر اہل مغرب کے کان کھڑے ہونے ہی تھے۔ چونکہ حزب التحریر بنیادی طور پر قومی ریاست کے تصور کی مخالفت اور موجودہ مسلم قومی ریاستوں کی جگہ ایک عالمی خلافت کے قیام میں یقین رکھتی ہے۔ اس لئے اہل مغرب کے دانشوروں اور لیڈروں کا اس پر چراغ پا ہونا بالکل فطری ہے۔ خصوصا برطانیہ پر ایسے کسی انقلابی اسلامی نظریے کی مخالفت تو اسکے اپنے نقطہ نظر سے لازم ہو جاتی ہے کیوں کہ در اصل اسی ملک نے عالم اسلام کے اتحاد کی آخری علامت، عثمانی خلافت کا خاتمہ کر کے موجودہ قومی ریاستوں کی بنیاد ڈالی تھی۔ مقصد اپنی مرضی کے حکمرانوں کو برسر اقتدار لاکر مسلمانوں کو آپس میں لڑانا تھا تا کہ وہ کبھی متحد ہو کر دنیائے عیسائیت اور خصوصا برطانیہ کے خلاف کسی سرگرمی، عمل کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔ دوسری جنگ میں تباہ ہو جانے کے بعد برطانیہ نے نام نہاد عالمی قیادت کی زمام امریکہ کے حوالے کر دی تھی اور اب دونوں بعض دوسرے مغربی ممالک کے ساتھ ملکر عالم اسلام کے اتحاد کی ہر کوشش کو ناکام بنانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

> برطانوی حکمرانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ انقلابی نظریات قانونی پابندیاں یا ایسی دوسری بندشوں سے نہ روکے جاسکتے ہیں اور نہ ہی ان کے طوفانوں پر کوئی بند باندھا جاسکتا ہے۔

حزب التحریر حال ہی میں مغربی ممالک خصوصا برطانیہ میں کافی مقبول ہو گئی ہے۔ چونکہ برطانیہ میں دنیائے اسلام کے تقریبا تمام ہی ممالک سے طلبہ تعلیم کی غرض سے آتے ہیں اور جو بعد از تعلیم اپنے اپنے ملکوں میں اعلی عہدوں پر بھی فائز ہوتے ہیں اسلئے ان لوگوں کا حزب التحریر کے اتحاد اسلامی جیسے انقلابی نظریے سے متاثر ہونا برطانیہ کے نقطہ نظر سے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کی یونیورسٹیوں نے آزادی اظہار خیال کے چیمپئن ہونے کے باوجود حزب التحریر کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ مغرب آزادی اظہار خیال کی اجازت اسی وقت تک دیتا ہے جب تک اسکے اپنے مفادات پر آنچ نہ آئے۔ جیسے ہی ایسی کوئی صورت حال ہوتی ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے ایسے گروہوں پر پابندی عائد کردیتے ہیں جو کسی ایسے نظریے کے مبلغ ہوتے ہیں جس سے ان کے مفادات کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حزب التحریر پر پابندی لگانے کے لئے بعض برطانوی یونیورسٹیوں نے یہ بہانہ ڈھونڈا ہے کہ اسکے ممبر ہندوؤں اور یہودیوں کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کر رہے ہیں جس سے ماحول میں تناؤ پیدا ہو رہا ہے۔

لیکن یہ محض بہانے بازی ہے۔ اصل وجہ وہی ہے کہ حزب التحریر کا مسلم اتحاد اور خلافت کا نظریہ جو برطانوی اور غیر برطانوی مسلم طالب علموں میں روز بروز مقبول ہو رہا ہے، انہیں اپنے مفادات کے لئے خطرناک نظر آتا ہے۔ لندن اسکول آف اکنامکس، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز اور کنگس کالج ان اداروں میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں جنہوں نے حزب التحریر کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہ دانشگاہیں ہیں جہاں اچھی خاصی تعداد میں مسلم طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ یہ برطانیہ کے بہترین تعلیمی ادارے ہیں جہاں کے فضلاء بالعموم یا تو اچھے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں یا علمی و تعلیمی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے اپنے ممالک کی پالیسیوں یا نئے طلبہ کی ذہنی تعمیر میں اہم رول ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ چونکہ برطانوی کافی دور اندیش واقع ہوئے ہیں، اسلئے انہوں نے دیکھ لیا کہ حزب التحریر کی سرگرمیاں مستقبل میں کافی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔

> پابندی کے اقدامات در اصل ہندوستان میں ایک امریکی اور تین برطانوی شہریوں کے اغوا کا نتیجہ ہیں اس اغوا کے پیچھے لندن اسکول آف اکنامکس کے ایک سابق طالب علم احمد شیخ کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔

چونکہ اس پابندی سے برطانیہ کے اس دعوے پر حرف آتا ہے کہ وہ آزادی اظہار خیال کا علمبردار ہے، اس لئے وہ اپنی اس غیر جمہوری حرکت کی مختلف انداز میں توجیہ کر رہے ہیں۔ مثلا کسی نے کہا کہ اس گروہ کے ایک پمفلٹ میں ہندوازم پر اعتراض کرنے کے علاوہ کشمیر اور دوسرے مقامات پر جہاد برپا کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اسی طرح ایک دوسرا الزام یہ ہے کہ حزب التحریر نے ایک پوسٹر کے ذریعہ یہ اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کی ملاقات صرف میدان جنگ ہی میں ممکن ہے۔

حزب التحریر کے خلاف برطانوی یونیورسٹیوں کے اقدامات در اصل ہندوستان میں ایک امریکی اور تین برطانوی شہریوں کے اغواء کا نتیجہ ہیں۔ اس اغواء کے پیچھے لندن اسکول آف اکنامکس کے ایک سابق طالب علم احمد شیخ کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ حزب التحریر نے احمد شیخ سے کسی بھی قسم کے تعلق سے انکار کیا ہے مگر برطانوی یونیورسٹیوں کے ذمہ دار ان کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ در اصل وہ لندن کی خلافت کانفرنس کی کامیابی کے بعد ہی سے حزب التحریر کے پر کترنے کی فکر میں تھے۔ انہیں یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ یہ گروہ برطانوی دانشگاہوں میں ہر ماہ تقریبا سات سو میٹنگیں کر کے مسلمان طلبہ کے ذہن کو اسلامی بنانے میں مصروف ہے جو مستقبل میں برطانیہ اور مغرب کی پالیسیوں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ کسی نے یہ کہکر پابندی لگا دی کہ باہری عناصر کیمپس کے ماحول کو "زہریلے پمفلٹ" تقسیم کرکے مسموم کر رہے ہیں یا یہ کہ گروہ کے ممبر صحیح انداز میں مختلف ہالوں میں اجتماع کی اجازت نہیں لیتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ساری بہانے بازیاں عذر گناہ بدتر از گناہ کی مانند ہیں۔ مگر یہ بات بہر حال طے ہے کہ انقلابی نظریے قانونی پابندی یا ایسی دوسری بندشوں سے نہ روکے جاسکتے ہیں نہ دبائے جاسکتے ہیں۔ ●

آسٹریلیا کے مسلمان ترک سکونت پر مجبور

آسٹریلیا میں آباد ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں میں سے بے شمار افراد کے ساتھ خوف زدگی اور کڑے پن کے سلوک نے انہیں سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہاں مزید رکنا عقلمندی نہ ہوگی۔ کین برا بیورو آف امیگریشن اینڈ پاپولیشن ریسرچ میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق اس خوف وہراس کی کئی شکلیں ہیں جو خلیجی جنگ اور اس کے فورا بعد کے دور میں سامنے آئی ہیں۔ اس کی واضح ترین مثال روایتی حجاب پوش عورتوں کی ہے جن کو ایک طرح سے معاشرہ سے خارج کر دیا گیا۔ ملبورن کی موناش یونیورسٹی میں سماجیات کے پروفیسر گاری بوما کی تیار کردہ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بعض عورتوں نے یہ اشارہ دیا کہ حجاب پوشی ان کے حصول ملازمت کی راہ میں رکاوٹ بنی ہے۔

انٹرویو دینے والی ایک خاتون نے بتایا کہ زندگی ان کے لئے خاصی مشکل ہو گئی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ لوگ ان کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ جیسے وہ ان کے لئے اجنبی ہوں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ رپورٹ بھی اسی دن منظر عام پر آئی جب کینبرا میں اس نئے قانون کا اعلان ہوا کہ نسلی منافرت پھیلانے والے اشخاص کو قید کی سزا سنائی جائے گی۔

اگلے ہفتے پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے نسلی منافرت مخالف قانون کی رو سے ایک مساوی مواقع کا ٹربیونل عوامی سلوک کے ایسے معاملات کی سماعت کرے گا جس میں نسل، رنگ یا گروہی تعصب کی بنا پر کسی کی توہین کی گئی ہو یا اس پر حملہ کیا گیا ہو۔

تاہم پروفیسر کے مطالعے میں مسلمانوں کی آبادیوں کو آسٹریلیا کی ترقی کی تاریخ کے ایک باب سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جس کی بنا پر اسے ایک ثقافتی اور مذہبی ثبوت کے حامل ملک کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس مطالعہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ظاہر کی گئی ہے یعنی ایک فیصد جو لبنان ترکی وغیرہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کی شکل میں گذشتہ پچیس سالوں کے دوران وہاں نشو ونما پاتی رہی حالانکہ اس سے پہلے لوگوں نے مسلمانوں کا نام بھی

> ایک مسلم خاتون کا کہنا ہے کہ ان کی زندگی خاصی مشکل ہو گئی ہے لوگ ان کی طرف ایسے دیکھتے ہیں کہ جیسے وہ اجنبی ہوں۔ وہاں کے مسلمانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ انہیں مذہبی ناروا داری اور کٹر پن کا شکار بننا پڑ رہا ہے۔

نہیں سنا تھا۔ اور یہ مسلمانوں کے لئے کارنامے سے کم نہیں کہ انہوں نے مذہبی اور ثقافتی جذبے کی تسکین کے لئے وہاں مساجد تعمیر کیں۔

انٹرویو کئے گئے 81 افراد میں سے 38 نے یہ اعتراف کیا کہ انہیں خوف زدہ کیا جاتا رہا ہے اور کٹر پن اور مذہبی ناروا داری کا شکار بننا پڑا ہے۔ پروفیسر بوما نے رپورٹ میں لکھا ہے کہ حقیقی یا خوف سے پیدا شدہ تعصب نے بعض لوگوں کے لئے وہاں رہنا مشکل کر دیا ہے اور آسٹریلیا میں سکونت باقی رکھنے کی خواہش کو مشکوک بنا دیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ ان پر حملوں کا مقصد بھی یہی ہو لیکن یہ بات آسٹریلیا کے ان کثیر ثقافتی ملک ہونے کے دعووں کے منافی ہے اور اس سے ترک وطن کی پالیسیوں کی بھی نفی ہوتی ہے جن کے تحت مسلمانوں پر آسٹریلیا کے دروازے کھلے تھے۔

جن تارکین وطن سے انٹرویو لیا گیا ان میں سے بیشتر کا تاثر یہ تھا کہ انہیں آسٹریلیا کے مقامی لوگ حقارت ونفرت سے دیکھتے ہیں اور بعض اوقات انہیں سوچنا پڑتا ہے کہ اگرچہ وہ آسٹریلیا کے ہی ہیں لیکن تعصب کے ہاتھوں انہیں وہاں سے نکلنا پڑے گا۔

اس کے برعکس چند افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے یہ بتایا کہ شروع میں ان کے آسٹریلیا میں آمد کے وقت کے مقابلے میں حالات کہیں بہتر اور خوش گوار تھے اس کی وجہ غالبا یہ ہے کہ آسٹریلیا کی قوم اور ادارے رفتہ رفتہ اسلام سے مانوس ہو چکے ہیں۔ ایک بوسینیائی مسلمان نے بیان کیا کہ اسے آسٹریلیائیوں کی طرف سے تعصب کے کسی مظاہرے کا کوئی تجربہ نہیں ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ تر لوگ نہیں جانتے کہ ان کا مذہب کیا ہے کیونکہ وہ اسلامی وضع قطع میں نہیں رہتے۔ ●

مسلم انقلابیوں سے مغرب پر لرزہ طاری

ڈاکٹر احمد خوندی کی فکر انگیز تحریر — مسعود الرحمٰن خاں ندوی کی تلخیص

خوف انسان کی فطری صفت ہے، جو کسی خطرہ کے موقع پر انفعالی حالت سے پیدا ہوتا ہے، اور اکثر سابق تکلیف دہ تجربات کی وجہ سے نفس انسانی اس کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اہل مغرب کو ان کے پیچھے اسلام ومسلمانوں کی روشن تاریخ نظر آتی ہے، اور سامنے اسلام ومسلمانوں کے پرامید مستقبل کی کرنیں دکھائی دیتی ہیں، اور جب ان کو بعض موجودہ اسلامی جماعتوں کے خیالات سننے کا موقع ملتا ہے تو ان کو اندیشہائے دور ودراز گھیر لیتے ہیں اور ان پر خوف ورعب کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا اہل مغرب واقعتاً اسلام سے خائف ہے؟ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا شخص آپ کے مال وعزت پر ہاتھ ڈال سکتا ہے؟ آپ کے اہل وعیال کو قتل کر سکتا ہے؟ آپ کی دولت وثروت کو من مانے طور پر لوٹ سکتا ہے؟ آپ کی ملکیت میں تصرف بے جا کر سکتا ہے؟

دراصل آج وہ ہم سے نہیں ڈرتے حقیقتاً وہ اس امت میں بیداری کی علامات دیکھ کر مستقبل کے مسلمان سے ڈرتے ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ ان کے اس نام نہاد خوف اور دوسروں کو ڈرانے کی چال کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہو؟ کیا صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مغرب اسلام سے خائف ہے؟ یا زیادہ مناسب بات یہ ہوگی کہ ہم یہ معلوم کریں کہ یہ خوف کیوں ہے؟ اس کے اسباب کا ہر پہلو سے مطالعہ کریں، پھر اس کا علاج کریں۔

اہل مغرب اور دیگر دشمنان اسلام کے اسلام سے خوف اور دوسروں کو ڈرانے کے کچھ اسباب درج ذیل ہیں:

1۔ تاریخی اسباب:

اسلام نے اپنے ابتدائی پچیس سال کے اندر اس زمانے کی دو عظیم ترین سلطنتوں کو ختم کردیا جہاں ظلم وستم، استحصال اور قوتوں کو غلام بنانے کا مزاج تھا۔ مشرق میں مسلمانوں نے مجوسی فارسیوں کو مغلوب کیا، اور ان کی سلطنت ختم کردی۔ ادھر رومیوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں تبوک وموتہ وغیرہ کے معرکے پیش آئے اور یرموک میں ذلت ناک شکست کے بعد وہ ملک شام سے نکالے گئے۔ پھر خلفائے راشدین کے بعد امویوں، عباسیوں اور عثمانیوں نے اس مہم کی تکمیل کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق محمد الفاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا جس کا نام ترکوں نے اسلام بول رکھا تھا۔ لیکن تحریف کے بعد آج اس کو استنبول کہا جاتا ہے۔ اہل مغرب اس بات کو نہیں بھول پاتے کہ عثمانی یوروپ کے قلب ویانا کے دروازوں تک پہنچ چکے تھے، اسی طرح فرانس کی سرزمین پر معرکہ بلاط الشہداء (بواتیہ) کو نہ وہ بھولتے ہیں نہ مسلمان۔

اسلام نے اپنے ابتدائی پچیس سال کے اندر دو ایسی عظیم سلطنتوں کو ختم کردیا تھا جہاں ظلم واستحصال کا مزاج تھا۔ ادھر رومیوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں تبوک وموتہ وغیرہ کے معرکے پیش آئے اور یرموک میں شکست کے بعد وہ شام سے نکالے گئے۔

تاریخی یادداشت کا یہ عامل ان اسباب میں سے ایک ہے جو آج اہل مغرب کو اسلامی قوت کے امکانی خطرات سے ڈراتا رہتا ہے۔

جہاں تک اسلام سے یہودیوں کے خوف اور ان کی ریشہ دوانی کا تعلق ہے تو حقیقی بات یہ ہے کہ وہ اپنی نفسیاتی کیفیت اور مذہبی اعتقادات کی وجہ سے نہ صرف اسلام بلکہ ہر غیر یہودی مذہب وملت کے خلاف ہیں۔

2۔ جغرافیائی اسباب:

یہاں کرہ ارضی کے درمیان نقل وحرکت کی اہم رہ گذاروں اور پانی کی اہم گذرگاہوں پر اسلامی ممالک کا فیصلہ کن موقع محل پر اقتدار قابل ذکر ہے جیسے تنگنائے باب المندب وجبل طارق، خلیج فارس، ونہر سوئیز اور نیل وفرات ودجلہ کی نہریں وغیرہ۔ یہ تمام مواقع پوری تاریخ میں ہمیشہ ان لوگوں کے لئے طاقت وقوت کا سبب رہے جن کا ان پر اقتدار تھا۔ لہذا ان علاقوں میں پوشیدہ امکانات کی ملکیت اور ان پر اقتدار کی مسلمانوں کو کیسے اجازت دی جا سکتی ہے؟

3۔ اقتصادی اسباب:

اسلامی ممالک آج دنیا کی طاقت کے اہم ترین چشموں پر قابض ہیں۔ اگر پیٹرول کے ان مغرب کی طرف ابلتے ہوئے چشموں کو خواہ اپنی عزت نفس، شجاعت وجوانمردی، مصلحت یا کسی اور سبب کی خاطر بند کردیا جائے تو یقیناً ان کے کارخانے ٹھپ ہو جائیں۔ ان کی ہوائی نقل وحرکت ٹھپ پڑ جائے۔ ان کی موٹریں وٹینک وغیرہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں اور پورا مغرب نقل وحرکت سے معذور ہو جائے۔

ان دنوں مغرب داخلی بحرانوں سے دوچار ہے۔ لہذا بیرونی دشمن کا ہوا کھڑا کرنا اس کے لئے ایک بہترین ہتھکنڈہ ہے تاکہ اندرونی حالات قابو میں رہیں اور معاشرتی تعلقات کا تانا بانا کسا رہے۔

4۔ اسلام سے ڈرانے میں ذرائع ابلاغ کا حصہ:

اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹی وی، سینما، تھیٹر وغیرہ رسائل ابلاغ ان معاصر اثرانداز اسباب میں شمار ہوتے ہیں جو قوموں کی فکری تعمیر میں سب سرگرم حصہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح تعلیمی نصاب بھی جو اپنے بنانے والے کے فکری رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور مدارس ودانش گاہیں ان فکری رجحانات کے لئے تمہید بنیاد اور زمین تیار کرتی ہیں۔ یہ دونوں وسائل ابلاغ وتعلیم ایسے غرض مند غیر اسلامی ہاتھوں میں ہیں جن کا مفاد اسلام کی تصویر بگاڑنے اور غیروں کو اسلام اور مسلمان سے خوفزدہ کرنے میں ہے۔ سامراج نے اسلامی ممالک سے نکلنے سے پہلے جان بوجھ کر ایسی لامذہبی قیادت تیار کی جو نہ صرف سامراجی فکر ونظر کی نمائندگی کرے بلکہ اس کے جانے کے بعد اس کی تبلیغ وترویج اور نشر واشاعت کے وسائل کی رہنمائی ونگرانی کرتی رہے۔ اس لامذہبی قیادت نے اسلام دشمن منصوبہ کے مطابق اسلام سے بیزار کرنے والے نئے تعلیمی نصاب تیار کئے اور ان کو رواج عام بخشا۔

5۔ تبدیل شدہ عالمی صورت حال سے متعلق اسباب:

مشرقی فوجی بلاک کے زوال کے بعد وہ مغرب کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا اور امریکا کی سربراہی میں مغرب دنیا کی دولت واقتدار کا تنہا مالک وحاکم بن گیا، مگر اس کو کبھی نئے مدمقابل کے سامنے آنے کے موہوم خطرہ سے ڈر نہ لگے گا، جو اس سے دنیا کے اقتدار میں مزاحمت کرنے لگے یا اس کے مفادات کے حصول میں راستہ کی رکاوٹ بنے، لہذا اس نے اپنے اقتدار کی حفاظت اور نئے مدمقابل کو ابھرنے سے روکنے کے لئے اپنے تمام وسائل وامکانات کو بروئے کار لانا ضروری سمجھا۔

مزید برآں ان دنوں خود مغرب داخلی بحرانوں سے دوچار ہے، لہذا بیرونی دشمن کا ہوا کھڑا کرنا اس کے لئے ایک بہترین ہتھکنڈہ ہے تاکہ اندرونی حالات قابو میں رہیں اور معاشرتی تعلقات کا تانا بانا کسا رہے۔ اس لئے اس نے ایک ایسے بیرونی دشمن کو چن لیا ہے جو اگرچہ موجودہ حالات میں اس کے مقابلہ کی طاقت سے محروم ہے۔ لیکن اس کی زمین میں نمو اور سرسبزی کے بیج پوشیدہ ہیں لہذا ان زرخیز بیجوں پر قاتل شعاعیں مرکوز کردی گئی ہیں، تاکہ ان کو موت کی نیند سلادیا جائے یا کم از کم کمزور کردیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس کی سب سے زیادہ وحشیانہ اسلوب کی نمایاں مثال بوسنیا ہے جب کہ دوسری جگہوں پر اس کے معاندانہ طریقے زیادہ تر پوشیدہ ہیں حالانکہ ان تمام مسائل کے پیچھے درحقیقت مغرب کی اپنے مفادات کو بچانے کی تگ ودو اور مسلمانوں کے خلاف اس کی تاریخی حسد کی کارفرمائی ہے۔

6۔ خود مسلمانوں سے متعلق اسباب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک وقت آئے گا جب اقوام عالم چہار جانب سے تم پر ایسے جھپٹ پڑیں گے جیسے بھوکے بے صبری سے پیالہ کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ کیا اسوقت یہ نوبت ہماری قلت تعداد کی وجہ سے پیش آئے گی؟ آپ نے فرمایا نہیں! بلکہ اس وقت تم سیلاب کے جھاگ کی طرح کثیر تعداد میں ہوگے۔ لیکن تمہارے دلوں میں کمزوری در آئے گی اور تمہاری دنیا سے محبت اور موت سے کراہیت کی وجہ سے تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت نکل جائے گی"

بیہقی نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ اس وقت آپ نے فرمایا "جب تم میں پانچ برائیاں پیدا ہوں گی، اس وقت تمہارا کیا بنے گا؟ میں اللہ تعالی سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تم میں پیدا ہوں یا تم ان زمانوں کو پاؤ۔

کسی قوم میں جب بھی علانیہ بے حیائی ظاہر ہوتی ہے تو ان میں طاعون اور ایسی دوسری بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو ان کے بزرگوں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

جو قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو آسمان بارش سے محروم کردی جاتی ہے اور اگر دیگر جاندار مخلوق نہ ہوں تو ان کے علاقہ میں بارش ہی نہ ہو۔

جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہو تو اس پر قحط سالی، شدید مصائب اور حاکم کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے۔

جس قوم کے حکام شریعت خدا کے بغیر فیصلہ کریں گے اللہ تعالی ان پر ان کے دشمن کو مسلط فرمادے گا جو ان کا سب کچھ چھین لے گا۔

اور جو قوم بھی کتاب اللہ وسنت نبوی کو پامال کرے گی، اللہ تعالی ان کے درمیان خانہ جنگی چھیڑ دے گا۔

گذشتہ زمانہ میں جن مسلمانوں نے دنیا میں اسلام کی اشاعت وتعارف کا کام انجام دیا تھا، انہوں نے اسلام کو قرآن وحدیث دونوں کے اعتبار سے صحیح صحیح سمجھا تھا، اس کے لئے اخلاص سے کام کیا تھا، اور صرف اسی کی راہ میں قربانی دی تھی، چنانچہ ہر شہر وعلاقہ میں ان کے شہداء، تاجر وسپاہی، عالم ومتعلم ہر حیثیت سے دوسروں کے لئے نمونہ تھے۔

مگر آج کے مسلمانوں کی موجودہ صورتحال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں حدیثوں میں مذکورہ اوصاف چسپاں ہوتے ہیں، کیونکہ:

- ان کی اکثریت اسلام کو جزوی طور پر سمجھتی ہے، ایک پہلو کو لیتی ہے تو دوسرے کو چھوڑ دیتی ہے۔
- ان میں معاشرتی امراض، فساد، رشوت، بدنظمی، جہالت وغیرہ کا دور دورہ ہے۔
- ان کے دنیادار کرسی اقتدار پر قبضہ جمائے، خوف، جہالت یا تابع مہمل بنے رہنے کی خواہش کی وجہ سے مغرب کی بانہوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔

مزید برآں اپنی بدعادتوں کے ذریعہ اسلام سے بیزار کرنے والی تصویر پیش کرتے ہیں، دنیا کو اس سے متنفر کرتے ہیں اور خوف دلاتے ہیں۔ ●

"ہم خون اور جان دیکر بھی اپنے شہیدوں کا انتقام لیں گے"

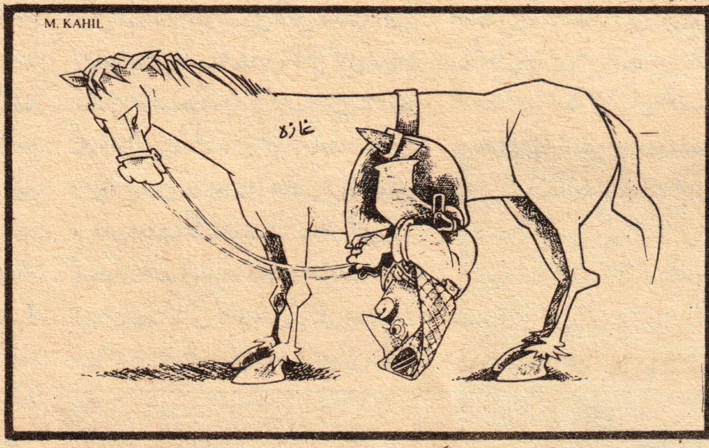
یاسر عرفات کو حماس کی دھمکی

امریکی صدر بل کلنٹن اور اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کے مسلسل دباؤ کے نتیجہ میں یاسر عرفات نے اسلامی جہاد اور حماس کے خلاف کارروائی تو شروع کردی ہے مگر اس کا نتیجہ متوقع طور پر خانہ جنگی کی صورت میں نمودار ہوا ہے 18 اکتوبر کو جمعہ کی نماز کے بعد غازہ شہر کی جامع مسجد کے نمازیوں اور فلسطینی پولس کے درمیان زبردست تصادم ہوا۔ جس میں ایک پولس مین سمیت 15 لوگ جاں بحق اور 2 سو سے زائد لوگ زخمی ہوگئے کئی لوگ اس وقت بھی زخمی ہوئے جب فلسطینی پولس نے اس بھیڑ پر گولی چلادی جو غازہ اسپتال کے باہر یہ معلوم کرنے کے لئے جمع ہوگئی تھی کہ مقتولین یا زخمیوں میں کہیں کوئی ان کا عزیز تو نہیں ہے۔ فطری طور پر یہ لوگ فلسطینی پولس سے ناراض ہوکر ان کے خلاف نعرے لگارہے تھے۔ بعض نے پولس پر پتھراؤ بھی کردیا جسکے نتیجہ میں ان پر گولیوں کی بارش کردی گئی۔

اس واقعے کے بعد یہودی بازآبادکاروں کی ایک بستی کے باہر فلسطینی مظاہرین پر اسرائیلی فوج نے گولی چلادی جس سے تین افراد جاں بحق ہوگئے۔ مغربی پریس نے اسے ایک نارمل خبر کے طور پر شائع کیا۔ وہ غصہ مذمت اور دھمکیاں دیکھنے کو نہ ملیں جو کسی اسرائیلی کے مرنے پر بالعموم مغربی اخباروں میں نظر آتی ہیں۔

مگر اس سے قطع نظر ضرورت یہ معلوم کرنے کی ہے کہ یہ پرتشدد واقعات رونما کیوں ہوئے؟ ملی ٹائمز کے پچھلے شمارے میں اس خبر کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا کہ تل ابیب بس دھماکے کے بعد اسرائیلی کابینہ نے حماس کے لیڈروں اور کارکنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جسے موساد کے ایجنٹ اور اسرائیلی فوج عملی جامہ پہنائیں گے۔ اسی منصوبے کے تحت حماس کے ایک سرگرم کارکن کو اسرائیلی ایجنٹوں نے ان کی کار کو بم سے اڑا کر ختم کردیا۔ فطری طور پر لوگوں میں اسکے خلاف غصہ تھا۔ یہاں تک کہ جب یاسر عرفات اس شہید کے جنازے میں شرکت اور ان کے اعزاء سے تعزیت کے لئے گئے تو وہاں موجود لوگوں نے نہ صرف ان کے خلاف نعرے لگائے بلکہ انہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اسی شہید کے قتل کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے حماس نے 18 اکتوبر کو نماز جمعہ کے بعد ایک مظاہرے کا اعلان کیا تھا۔ مگر جب نماز ختم ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ پوری مسجد فلسطینی سپاہیوں کے گھیرے میں ہے۔ پولس کو دیکھتے ہی لوگ غصے میں آگئے۔ پہلے تو تو میں میں اور پھر بعد میں تصادم کی نوبت آگئی۔

18 اکتوبر کے خونی واقعات کے بعد پی ایل او اور حماس کے تعلقات بہت زیادہ کشیدہ ہوگئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو تشدد کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ہر جابر حکمراں کی طرح یاسر عرفات نے اپنی پولس کا دفاع کرتے ہوئے حماس پر الزام لگایا ہے کہ اسکے کارکنوں نے دانستہ طور پر لوگوں کو تشدد پر ابھارا۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ حماس کو باہر سے فنڈ مل رہے ہیں تاکہ وہ امن معاہدے کو ناکام بنا سکیں۔ خارجی طاقت سے ان کی مراد ایران ہے۔



حماس کے ممبران کے مطابق نام نہاد امن معاہدہ فلسطینیوں کے ساتھ خیانت ہے۔ ان کا یہ بھی الزام ہے کہ عرفات نے عربوں کے دشمن اسرائیل سے محض ہاتھ ہی نہیں ملایا ہے بلکہ اپنے سیاسی مفادات کے لئے فلسطینیوں کا اسرائیل سے سودا کر لیا ہے۔ غازہ میں فلسطینی مظاہرین پر پولس فائرنگ نے حماس کے انداز فکر کو تقویت پہنچانے کے ساتھ ساتھ عرفات کو سیاسی سطح پر کمزور بھی کر دیا ہے۔

یاسر عرفات کی طرح پی ایل او میں شامل ان کی جماعت الفتح نے بھی جمعہ کے تشدد کے لئے حماس کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ الفتح نے یہ بھی کہا کہ پہلی گولی مظاہرین کی طرف سے چلائی گئی جسکے نتیجہ میں ایک پولس مین ہلاک ہوگیا۔ مگر اسکے برعکس حماس کے مختلف رہنماؤں نے یاسر عرفات اور ان کی پولس پر اسرائیل کے اشارے پر اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ حماس کی فوجی ونگ، عزالدین القسام نے تو باقاعدہ یہ اعلان کیا ہے کہ وہ فلسطینی پولس اور اسرائیل دونوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں کریں گے جس سے ظاہر ہے ماحول میں اور تناؤ پیدا ہوگیا ہے۔

اسرائیل نے اس واقعے کے فوراً بعد غازہ پٹی اور مغربی کنارے پر اپنے بازآبادکاروں کے تحفظ کے لئے مزید فوجیں بھیج دی ہیں۔ مگر یاسر عرفات اور ان کی پولس کو زبردست عوامی غصے کا سامنا ہے۔ عام آدمی کے ذہن میں یہ بات بتدریج جاگزیں ہوتی جارہی ہے کہ عرفات اسرائیل کے اشارے پر کچھ بھی کر گزریں گے۔ یہاں تک کہ اپنے بھائیوں کا قتل بھی کر سکتے ہیں۔ جمعہ کے شہیدوں کی لاشوں کو گھر لیجاتے ہوئے عوام یہ نعرے لگارہے تھے۔ "ہم اپنے خون اور جان سے تمہارا دفاع کریں گے اے شہیدو!" اسکا واضح مطلب ہے کہ فلسطینی پولس اور حماس کے کارکنوں کے درمیان مزید تصادم ہوں گے اور اس بات کا پورا امکان ہے کہ غازہ پٹی میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوجائے۔

اس متوقع صورت حال کا احساس کرکے بہت سے غیر جانب دار قسم کے فلسطینی امن کے قیام کے لئے میدان میں آگئے ہیں۔ عرفات نے خود ایک 20 رکنی امن کمیٹی قائم کی ہے مگر اس سے کچھ زیادہ امید نہیں باندھی جاسکتی۔ جارج حباش نے سارے واقعات کی غیر جانبدارانہ تفتیش کے لئے ایک 8 رکنی کمیٹی قائم کردی ہے۔ مگر سب سے زیادہ وہ فلسطینی سرگرم عمل ہیں جو اسرائیل کے اندر رہ رہے ہیں۔ ایک جانے مانے کمیونسٹ لیڈر محمد بارک نے خاص طور سے فلسطینی خود مختار اتھارٹی اور حماس کے نمائندوں کے مابین مذاکرات کے ذریعہ امن قائم کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر دونوں گروپ ایک آزادانہ تفتیش کے لئے تیار ہوگئے ہیں مگر اس امر پر اب بھی اختلاف ہے کہ 18 اکتوبر کے واقعات کا ذمہ دار کون ہے۔

غازہ میں پرتشدد واقعات کے بعد دوسرے ممالک میں بھی رد عمل ہوا ہے۔ ایران اور شام میں یاسر عرفات کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ مگر مصر، فرانس اور اسرائیل نے عرفات کی حمایت کرتے ہوئے بین الاقوامی برادری خصوصاً ان ممالک سے جنہوں نے امن معاہدے کے بعد غازہ واریحہ میں ترقیاتی منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے مالی امداد کے وعدے کئے تھے، اپیل کی ہے کہ وہ جلد از جلد وہ رقم ریلیز کریں تاکہ فلسطین میں بدامنی اور خانہ جنگی جیسی صورت حال پیدا ہو نہ سکے۔ عرفات کو رواں سال میں 7 سو ملین ڈالر سے زیادہ ملنے والے تھے مگر ابھی تک انہیں صرف سو ملین ڈالر ملے ہیں جو بمشکل پولس اور دوسرے افسران کی تنخواہوں کے لئے کافی ہیں۔ ترقیاتی منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے انہیں مزید فنڈ کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں خود اسرائیلی کابینہ میں بھی بحث ہوئی مگر ان کی مالی مدد شبہے سے بالاتر نہیں ہے۔

مغربی پریس اور وہاں کے سیاسی مبصرین اس نقطہ نظر کے حامی ہیں کہ عرفات بتدریج اپنے عوام میں غیر مقبول ہوتے جارہے ہیں جبکہ حماس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عام فلسطینی یہ دیکھ رہا ہے کہ عرفات کے امن معاہدے سے انہیں اسکے علاوہ کچھ نہیں ملا ہے کہ اب اسرائیلی فوج کے ساتھ ان کی نام نہاد اپنی پولس بھی ان پر گولیاں برسا رہی ہے۔ اسکے مقابلے

باقی صـ۱۲ـ پر

یہودی دہشت گردوں کو سرکاری تحفظ مگر مظلوم فلسطینیوں کو بندوق کی گولی

ابھی حال ہی میں مارٹن دران نے وہائٹ ہاوس پر گولیوں کی بوچھار کردی۔ پولس نے اسے فوراً گرفتار کر کے حراست میں لے لیا۔ اسی کے ساتھ پولس نے یہ اقدام بھی کیا کہ فوراً ہی مارٹن کے گھر کی حفاظت کے لئے وہاں پولیس تعینات کردی تاکہ عوام غم وغصے سے اسے زمین بوس نہ کردیں۔ اسی طرح چند ماہ قبل جب بروچ گولڈ اسٹین نے الخلیل کی مسجد ابراہیمی میں مسلم نمازیوں کو عین حالت نماز میں گولیوں سے بھون ڈالا تو اسرائیلی فوج نے فوراً اس کے گھر کو اپنے گھیرے میں لے لیا تاکہ ناراض فلسطینی اسے اپنے غصے کا نشانہ نہ بنا سکیں۔ ان دونوں "تحفظات" کے پیچھے منطق یہ کارفرما تھی کہ کسی مجرم کے گناہ کی سزا اس کے اہل خانہ کو نہیں ملنی چاہیے۔

لیکن فلسطینیوں کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی اسرائیل، پی ایل او سے ایک نام نہاد معاہدے کے ہوتے ہوئے بھی ان فلسطینی جانبازوں کے گھروں کو زمین بوس کردیتا ہے جو اسرائیلی ٹھکانوں پر حملے کرتے ہوں تاکہ ان کا وطن پورے طور پر آزاد ہوسکے۔ چنانچہ تل ابیب بم دھماکے کے مشتبہ جاں بحق سرفروش کے گھر کو پہلے تو اسرائیلی حکومت نے تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اب باقاعدہ وہاں کی عدلیہ نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ یہ اس ملک کی آزاد عدلیہ کا عالم ہے جسے اہل مغرب بادشاہوں کی تاریکی میں جمہوریت کے چمکتے ہوئے ستارے سے تعبیر کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ دنیا اس دوہرے معیار کی اجازت کیوں دیتی ہے؟ اسرائیل کے ایسے ظالمانہ اور جابرانہ اقدامات کی دنیا مذمت کیوں نہیں کرتی۔ یہ وہ ناانصافیاں اور تعصبات ہیں جو فلسطینیوں کو انتہا پسندانہ اقدام پر مجبور کرتے ہیں۔ دنیا امریکہ واسرائیل کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر فلسطینیوں کو آسانی سے دہشت گرد تو کہہ دیتی ہے، مگر ان کے ساتھ جو مسلسل ناانصافی ہو رہی ہے یا ان کے معاملے میں جو دوہرا معیار برتا جارہا ہے، اس پر نہ تو کوئی احتجاج کر رہا ہے اور نہ انہیں ختم کرنے کے لئے کوئی آگے آرہا ہے۔

دنیا امریکہ واسرائیل کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر فلسطینیوں کو آسانی سے دہشت گرد تو کہہ دیتی ہے لیکن ان کے ساتھ جو مسلسل ناانصافی ہورہی ہے اور انکے ساتھ جو دوہرا معیار برتا جارہا ہے ان کے خلاف کہیں سے کوئی صدائے احتجاج بھی بلند نہیں ہوتی۔

مذکورہ ناانصافی اور دوہرے معیار کو دنیا غالباً اس لئے بھی دیکھ نہیں پاتی کہ مغربی ایشیا کی امریکی واسرائیلی ذرائع ابلاغ جو تصویر پیش کر رہے ہیں، وہ انتہائی ناقص ہے۔ اس امریکی واسرائیلی تصویر کے مطابق مغربی ایشیا امن کی آغوش میں آنے کے لئے بے چین ہے۔ پی ایل او نے اسرائیل سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ اردن نے بھی حالت جنگ ختم کرنے کی بعد اسرائیل کے ساتھ ایک دوستانہ سمجھوتے پر دستخط کر دیئے ہیں صرف شام ایک ایسا ملک ہے جو ابھی بھی مزاحمت کر رہا ہے، لیکن بہت جلد وہ بھی تل ابیب سے امن معاہدہ کر لے گا۔ (تعجب خیز طور پر لبنان کا ذکر نہیں ہوتا جس کا ایک اچھا خاصہ علاقہ اسرائیل نے سیکورٹی زون کے نام پر ہتھیا لیا ہے) اس کے برعکس مغربی ایشیا میں چند ایسے "بے چہرہ، بے شرم، اور بد دماغ" لوگ بھی ہیں جو امن کی مخالفت کر رہے ہیں یہ بے مروت، لوگ اپنی دہشت گردانہ سرگرمیوں سے یہودیوں اور عربوں کا مستقبل تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان "دہشت گردوں" کو ختم کرکے باقی ماندہ عربوں، خصوصاً حافظ الاسد کو اسرائیل سے امن معاہدہ کے لئے تیار کر لیا جائے۔ کم وبیش مغربی ایشیا کی یہی تصویر مغربی ذرائع ابلاغ، خصوصاً امریکی واسرائیلی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پیش کر رہے ہیں۔ اور بظاہر اس پروپیگنڈے کا اثر بھی دکھائی دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرحوم فلسطینی جانباز کے رشتہ داروں کا گھر ڈھا دیئے جانے یا گذشتہ جمعہ کو یعنی 18 نومبر کو ان 14 فلسطینیوں کو گولیوں سے بھون دیئے جانے پر کہیں سے کوئی صدائے احتجاج نہیں بلند ہوئی جو نام نہاد

باقی صـ۱۴ـ پر

ہندوستانی مسلمانوں کی شہریت مشکوک

مسلم ووٹوں کی گزند سے بوکھلا

پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے لیڈر ہیں جناب لال کرشن اڈوانی ان کے وطن کے بارے میں ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا کہ وہ سندھ پاکستان میں کیوں پیدا ہوئے اور پیدا ہوئے تھے تو پھر وہ اچانک ہندوستانی شہری کیوں کر بن گئے اور انہیں ہندوستانی شہریوں کو لڑانے کا حق کیسے مل گیا۔

پھر خیر سے اپنے مدن لعل کھورانہ بھی ہیں جو دارالسلطنت دہلی صوبے کے وزیر اعلیٰ ہیں ان کا وطن بھی ہندستان نہیں ہے برابر کے ملک پاکستان سے آئے تھے اور ایسے آیے کہ آج ہندوستان کے راج دھانی والے صوبے کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو یہ غم بھی کھائے جا رہا ہے کہ اس ملک ہندوستان سے ایسے تمام لوگوں کو بے دخل کرایا جائے جو ان کے مطلب کے لوگ نہیں ہیں چاہے وہ یہاں کے پرانے رہنے والے ہی کیوں نہ ہوں۔

●

اسی ملک میں اور ہمارے۔ آپ کے زمانے میں سرائیکی زبان والوں کا ایک کنونشن ہوتا ہے اور پاکستان کے سرائیکی علاقوں کے بارے میں تجاویز پاس کی جاتی ہیں۔ اسی ملک میں اور اسی زمانے میں بمبئی شہر سے ایک اخبار SINDHRISES شائع ہوتا ہے جو آزاد سندھ دیش کی تحریک کی ترجمانی کرتا ہے اور تو اور ہمارے ملک کے اپنے حصے کشمیر اور پنجاب میں کوئی فرقہ وارانہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو حکومت ہند (جس کا آئین کھلم کھلا سیکولر ہے) ان علاقے کے سبھی رہنے والوں کو نہیں صرف ہندوؤں کو اپنے علاقے سے بھاگ کر ہندوستان کے کسی علاقے میں پناہ لینے ہی کی سہولت نہیں دیتی بلکہ ان کو وظیفے بھی عطا کرتی ہے اور مختلف کالونیاں بنانے کی اجازت بھی دیتی ہے۔

●

یہ سب کچھ ایک طرف اور دوسری طرف چار پانچ برس میں ایک غلغلہ اٹھتا ہے، اس کے اٹھانے والوں کے نام الگ الگ ہوتے ہیں کام ایک ہی ہوتا ہے یہاں کے رہنے والے لوگوں کے جائز شہری حقوق پر شک کرنا۔ یہ ابھی کل کی بات ہے یہ شور اٹھا تھا کہ آسام میں غیر ملکیوں کی آبادی بہت ہو گئی ہے لہذا جب تک ان لوگوں کو نکال باہر نہ کرایا جائے اس وقت تک وہاں الکشن نہیں کرایا جا سکتا۔ پھر اچانک در و دیوار پر عجیب و غریب نعرے لکھے دکھائی دینے لگے "غیر ملکیو! بھارت چھوڑو" وغیرہ وغیرہ اس کے بعد بوڈو علاقوں میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جانے لگا۔ ہر شخص کو یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اب آج خیر سے الیکشن کمشنر شری سیشن صاحب کو مہاراشٹر میں غیر ملکیوں کا زبردست خطرہ نظر آنے لگا اور اس خطرے کو دکھانے والے ہیں بھارتیہ جنتا پارٹی کے غیر ملکی رہنما شری لال کرشن اڈوانی۔

●

ذرا اس معاملے کے دوسرے پہلو پر غور کیجیے۔

دور دراز انگلستان میں ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اور حالت یہ ہے کہ وہاں وہ ووٹ بھی دیتے ہیں اور الکشن میں کھڑے بھی ہوتے ہیں حد یہ ہے کہ وہاں بھی مندر مسجد بنانے کے سوال پر آپس میں لڑتے ہیں اگر کبھی وہاں کی حکومت کسی قسم کا بھی ترجیحی سلوک ان سے کرتی ہے تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور بر ملا کہتے ہیں کہ وہ آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں اور اس اعتبار سے انہیں برابر کے حق حاصل ہیں۔

یہ سب حقوق۔ حتی کہ انگلستان میں مندر بنانے کا حق، تو انہیں حاصل ہیں لیکن ان کے اپنے ملک ہندوستان میں کسی کو کوئی حق حاصل



سندھ سے آئے اڈوانی مسلمانوں کو غیر ملکی بتاتے ہیں: بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے۔

نہیں۔ لال کرشن اڈوانی فرقہ پرست سیاست کا شکار ہوکر محض مذہب مختلف ہونے کی بنا پر ہندوستان میں پناہ گزیں نہیں یہاں کے شہری تو ہو سکتے ہیں مگر یہ سب مراعات صرف ایک مذہب اور دھرم کے لوگوں کے لیے ہے جن کے لیے ہمارا آئین بالکل خاموش ہے۔

جب بھی ہندوستان کی فرقہ پرست پارٹیوں کو اپنی سیاست متزلزل اور اپنا مستقبل خطرے میں دکھائی دیتا ہے تو کوئی نہ کوئی فرقہ پرستانہ سوال اٹھاتے ہیں اور اسے الجھا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔

ابھی بابری مسجد کا قضیہ تھا اور اس پر سینہ ٹھونک کر کھلم کھلا پورا سنگھ پریوار کہتا ہے کہ وہ عدالت کا فیصلہ تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ عدالت کا فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہوگا اب نیا شوشہ سیشن کی طرف سے اٹھایا گیا ہے کہ مہاراشٹر میں مسلمانوں کی بڑی آبادی باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی ہے لہذا انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہوگا تا وقتیکہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت داخل نہ کریں سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں کسی دوسرے ملک سے لوگوں کو آکر بس جانے کی اجازت دینے والے کون تھے اور کیوں انہوں نے اتنی بڑی غلطی کی؟

آج اگر ہندوستان کے کسی شہری سے اس کے باپ کا راشن کارڈ، اس کے وطن کا تصدیق نامہ اور اس کی شادی کا سرٹیفکیٹ طلب کیا جانے لگے تو آدھے سے زیادہ ملک حق شہریت سے محروم ہو جائے گا۔

ابھی کچھ مہینے پہلے کی بات ہے شری کھورانہ نے جامعہ نگر دہلی کے علاقے میں بنگلہ دیشیوں کے خلاف مہم چلانے کا ارادہ کیا تھا تاکہ اس پردے میں اس علاقے میں فرقہ وارانہ منافرت پیدا کی جایے اور کمال یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قومی یک جہتی کا نام لیتے ہیں اور ہندوستان کو بانٹ دینے کی ذمہ داری دوسروں کے سر رکھتے ہیں اور اپنی اس قسم کی احمقانہ حرکتوں سے اپنوں کو بانٹتے اور کاٹتے چلے جاتے ہیں ان کو اندازہ نہیں کہ یہ زخم جو وہ اپنوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں کتنے خطرناک، کتنے مہلک ہیں یہ تقسیم کے اصل زخم یہی ہیں اور یہی در اصل تقسیم وطن کے ذمہ دار بھی ہیں اور اسے قائم رکھنے والے بھی۔

●

ایک طرف انگلستان اور امریکہ جیسے ملک ہیں، جرمنی اور دبئی جیسی ریاستیں ہیں جہاں جس ہندوستانی کا منہ اٹھتا ہے چلا جاتا ہے اور ان کی معیشت میں اپنا حصہ بٹاتا ہے اور اس وقت یہ بھی نہیں پوچھتا کہ ان ریاستوں میں اور اس میں کیا چیز مشترک ہے؟ مذہب اور دھرم ان کا جداگانہ؟ معیشت ان کی الگ؟ تہذیب اور زبان ان کی مختلف؟ اور ان ریاستوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورتے وقت کوئی یہ بھی نہیں سوچتا کہ اس ملک پر اس کا کوئی حق نہیں ہے اور دوسری طرف ہمارے اسی ملک کے رہنے والے بھائی اپنے کل کے ہموطنوں سے نہیں بلکہ اپنے آج کے ہموطنوں کو غیر ٹھہرا کر ان سے شہریت کا ثبوت مانگ رہے ہیں کہ انہیں دونوں جہاں کی وہ دولت عطا کر سکیں جسے ووٹ دینے کا حق کہتے ہیں۔

اس قسم کی ریشہ دوانی پر اگر آج روک نہ لگائی گئی تو کل بھارتیہ جنتا پارٹی اور ان کے حواریوں کی ہمتیں اتنی بڑھ جائیں گی کہ وہ اس ہندوستانی سے کسی نہ کسی بہانے حق شہریت اور حق رائے دہندگی چھین لیں گے جو ان کی حمایت نہیں کرتا۔ فاشزم کا پرانا نعرہ ہے "جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارا دشمن ہے" اور اس دشمن کے ساتھ ہر قسم کا برتاؤ روا ہے۔ خنجر اور تلوار سے بھی اور قلم اور زبان سے بھی۔ دائرہ تنگ سے تنگ کرنا فاشزم کا پرانا کھیل ہے البتہ کھلاڑی نئے بھی ہیں اور اناڑی بھی۔ انہیں ابھی علم نہیں کہ تاریخ کا فیصلہ اس قسم کے کٹرپن کے لئے ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔

ہم ہرگز نہیں کہتے کہ ملک میں آنے جانے والے غیر ملکیوں کو ووٹ دینے کا مکمل حق حاصل ہونا چاہیے مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہر کس و ناکس کو یہ حق تو نہیں ملنا چاہئے کہ وہ جب چاہے اور جس کسی کو چاہے غیر ملکی قرار دے دے اور بار ثبوت بھی اسی کی گردن پر ڈال دے۔ آئین اور قانون میں تو مجرم پر بھی اپنے کو نیک ثابت کرنے کا بار ثبوت نہیں ہوتا پھر یہ کیسا انصاف ہے کہ پہلے الزام تراش لیا جائے پھر اسی پر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا بار بھی عاید کر دیا جائے۔

●

کسی ملک کا شہری ہونا ایک افتخار ہوتا ہے خواہ کوئی اپنے ملک میں کیسی ہی نکبت اور ناداری کی زندگی گزار رہا ہو پھر بھی اس کے دل میں کہیں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ وہ اس کا اپنا ملک ہے۔ دنیا

شہریت ک

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ دستور ہند نے اقلیتوں کو جو مراعات و تحفظات دی تھیں اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت آج تک اسی بات میں الجھی ہوئی ہے کہ اس کے تشخص، اس کی کتاب، اس کی عبادت گاہ اور اس کی تعلیم گاہ مزید برآں اس کے جان و مال کا تحفظ کیسے کیا جائے۔ بھارتیہ کرن کے نعرے سے لے کر کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے آسمانی صحیفہ ہونے کو چیلنج کرنے تک بابری مسجد سمیت متعدد مقامات مقدسہ کی شہادت سے لیکر مختلف تعلیم گاہوں کے اقلیتی کردار کے چھننے اور مذہبی درسگاہوں پر حملے وقبضے تک اور فرقہ وارانہ فسادات کے نہ رکنے کے سلسلے سے لے کر مسلمانوں کو شہری حقوق تک سے دستبردار کرنے کی داستان سے یہ آدھی صدی بھری پڑی ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جن سے متاثر ہوکر وزیر سماجی بہبود سیتارام کیسری نے یہاں تک کہہ دیا کہ کسی کو مسلمانوں کی شہریت کے سلسلے میں سوال کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ وہ مسلم حضرات ہیں جنھوں نے تقسیم وطن کے بعد اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کی شہریت کے سلسلے میں کوئی سوال اٹھانا دراصل ان کی حب الوطنی پر شبہ کرنا ہے اور یہ یقیناً ایک شرمناک حرکت ہے۔

کانگریس کے ایک دوسرے بڑے لیڈر طارق انور جو کہ اس پارٹی کے اقلیتی سیل کے صدر بھی ہیں نے بھی اس سلسلے میں سخت تنقید کرتے

اس شمارے کی قیمت: تین روپے
سالانہ چندہ ایک سو پچاس روپے / سو امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
الفا آفسیٹ پریس سے چھپواکر
دفتر ملی ٹائمز 49، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی 110025 سے شائع کیا۔
فون: 6827018

نیا جال لائے پرانے شکاری

ئے سیاستدانوں کا نیا حربہ

پروفیسر محمد حسن

بھر میں اگر کوئی حصہ ایسا ہے جس پر اپنائیت کا حق ہے تو وہ یہی ہے ۔ لیکن اگر اس پر بھی محرومی کی ضرب پڑنے لگے تو پھر غیریت کے سوا کیا چارہ ہے ؟ ... یورپ کے ملک تو ایشیا کے لوگوں تک کو اپنے دامن میں پناہ دے رہے ہیں یہی نہیں خود ایشیا کے مفلوک الحال ممالک ... افغانستان ایران سے لے کر سعودی عرب اور دبئی تک کے دروازے ہر مذہب اور دھرم کے ہندوستانیوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور ہندوستانی یورپ کے ممالک کے انتخابات میں حصہ بھی لے رہے ہیں اور خود ہم اپنے ملک میں اس قدر تنگ دلی کا سبق پڑھا رہے ہیں کہ اپنے اپنوں سے بے بہرہ ہو جائیں اور ناخن پوست سے جدا ہو جائے ۔

●

ہندوستان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہم اصل مفہوم کو غیر متعلق معاملوں میں الجھا کر چھپا کر پیش کرتے ہیں جس سے ہماری اصل غرض ظاہر نہ ہو اور ہماری ذہنیت کی پستی اور تعصب پر بھی پردہ پڑا رہے ۔ یہاں بھی یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے ہر مسلمان کو کسی نہ کسی طریقے پر غیر ملکی ثابت کر دیا جائے تاکہ اس کے ووٹ کی گزند سے فرقہ پرست پارٹیاں محفوظ رہیں اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو ان کی فکر نہ رہے مگر اس بات کو برملا کہنے سے فرقہ واریت کا کھلا ہوا لیبل اور بھی برملا ہو جائے گا ۔ اس لئے اسے اس ڈھنگ سے دبا کر چھپا کر کہا جا رہا ہے کہ ملک میں غیر ملکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ان غیر ملکیوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں ملنا چاہیے ۔ بظاہر سیدھا سادہ سا مطالبہ ہے مگر اس کے پیچھے پوری سیاسی کاٹ چھانٹ اور فرقہ وارانہ گندگی موجود ہے جس کے تحت آسام میں آج سے نہیں کئی سال سے مسلمانوں کا کھلم کھلا قتل عام جاری ہے ۔ آئین خاموش ہے ۔ قانون گونگا ہے اور حکمراں حیران ۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اس کا پرچار کرنے والوں کو پوری آزادی ہے ان کی زبان اور قلم پر کوئی پابندی لگائے تو بھی کیسے لگائے کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی اگر بال ٹھاکرے کے خلاف ہو تو اس پر عمل در آمد کرانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ۔

> بظاہر سیدھا سادہ سا مطالبہ ہے مگر اس کے پیچھے پوری سیاسی کاٹ چھانٹ اور فرقہ وارانہ گندگی موجود ہے جس کے تحت آسام میں آج سے نہیں کئی سال سے مسلمانوں کا کھلم کھلا قتل عام جاری ہے ۔ آئین خاموش ہے ۔ قانون گونگا ہے اور حکمراں حیران ۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اس کا پرچار کرنے والوں کو پوری آزادی ہے ان کی زبان اور قلم پر کوئی پابندی لگائے تو بھی کیسے لگائے ۔

ہم نہیں جانتے کہ آگے کیا ہو گا لیکن ملک اور قوم آج جس دوراہے پر کھڑے ہیں وہاں فاشزم کے خطرے سے انہیں آگاہ کرنا ضروری ہے جب ہٹلر نے جرمنی میں نازی ازم کی بنیاد رکھی تھی تب بھی اسی قسم کے حربے استعمال کئے تھے اور قومیت کے نام پر پوری جرمن قوم کو "متحد" کرنے کی ٹھانی تھی پھر اس متحد جرمن قوم میں سے بھی چن چن کر اپنے مخالفوں کو مارا جانے لگا اور فاشزم کے طوفان میں ڈوب گئی ۔ وہ دن ابھی دور ہے مگر اس طرف ہندوستان کے چھوٹے بڑے ہٹلر تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں اور ضروری ہے کہ قیمت خواہ کچھ بھی کیوں نہ دینی پڑے ان کو اس راستے پر آگے بڑھنے سے روکا جائے ورنہ ایک دن وہ آئے گا جب ان کے اپنے حواریوں کے علاوہ ہندوستان میں ہر شخص غیر ملکی قرار دے دیا جائے گا اور وہی اکیلے ملک و ملت کے ٹھیکیدار رہ جائیں گے باقی جو ہونگے وہ یا قتل گاہوں میں ہونگے یا قید خانوں میں ۔ اس دن کی فکر آج اور ابھی کرنا ضروری ہے ۔

●

ے ثبوت کا مطالبہ دستور ہند کے ساتھ مذاق

آصف عمر

ہوئے یہ کہا ہے کہ چیف الیکشن کمشنر سیشن کے ان اقدامات سے سیاسی بو آتی ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں صدر جمہوریہ ہند اور وزیر داخلہ سے سخت احتجاج کیا ہے ۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک یہ نہیں واضح ہو سکا ہے کہ بمبئی میں ساڑھے چار لاکھ کے قریب مسلم شہریوں کو اپنی شہریت ثابت کرنے کے سلسلے میں جو نوٹس جاری کیا گیا ہے اس میں کس کا ہاتھ ہے ؟ مہاراشٹر کی حکومت اس سلسلے میں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتی ہے اور چیف الیکشن کمشنر ٹی این سیشن کو اس کا ذمہ دار مانتی ہے جب کہ سیشن ریاستی حکومت پر الزام لگاتے ہیں ۔

تین نومبر کو مہاراشٹر کی اسمبلی میں اس سلسلے میں جو ڈرامہ ہوا وہ بھی بڑا دلچسپ ہے ڈاکٹر رفیق زکریا کے ایک سوال کے جواب میں وزیر اعلیٰ شرد پوار نے یہ کہا کہ وہ چیف الیکشن کمشنر کے احکامات پر عمل کرنے کے پابند ہیں ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دراصل سیشن نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ بی جے پی کا ہی مطالبہ بنگلہ دیش پناہ گزینوں اور پاکستانیوں کو بمبئی سے نکالنے کے سلسلے میں تھا اس کے جواب میں ہے اور بمبئی کے مختلف علاقوں میں جو نوٹس بھیجے گئے ہیں وہ بی جے پی نے ہی فراہم کئے ہیں ۔

واضح رہے کہ بمبئی میں یہ ڈرامہ 18 ستمبر 94 کو شروع ہوا جب وہاں کی مقامی پولیس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں نوٹس جاری کیا ۔ " ہمارے علم میں اس حلقے کے الیکشن آفس کے ذریعے یہ بات لائی گئی ہے کہ آپ غیر ملکی شہری معلوم ہوتے ہیں "

تقریباً سوا ماہ کے بعد مذکورہ بالا حلقے کے افراد سے یہ کہا گیا کہ وہ کاغذ ثبوتوں میں سے کوئی بھی پیش کریں جس سے ان کی شہریت ثابت ہو جائے ۔ پیدائش کا سرٹیفکیٹ، ہندوستانی پاس پورٹ، شہریت کا سرٹیفکیٹ یا حکومت کے شہریت کے رجسٹر میں اندراج ۔ اس نوٹس میں آخر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر آپ مذکورہ بالا ثبوتوں میں سے کچھ بھی پیش نہیں کر سکے تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ ایک غیر ملکی شہری ہیں اور جب 1946 کے غیر ملکی قانون و دیگر متعلقہ قوانین کے تحت آپ کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے گی ۔

مسلمانوں کی شہریت سے متعلق یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے ۔ کہنے کو تو یہ مسئلہ الیکٹورل فارم کے پر کرنے کے دوران دہلی اور بمبئی میں پیدا ہوا لیکن اس کا سیدھا تعلق بنگلہ دیشی پناہ گزینوں اور پاکستانیوں کے نام پر اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت جو دوسرے شہریوں کی طرح حقیقی شہری ہیں ہے ۔ ایک سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1982 سے لیکر اب تک بمبئی میں پانچ ہزار پانچ سو پچاس بنگلہ دیشی پناہ گزین داخل ہوئے ہیں جن میں سے پانچ ہزار تین سو چھیاسی کو ان کے وطن بنگلہ دیش بھیجا جا چکا ہے ۔ گویا کل 184 بنگلہ دیشی پناہ گزین وہاں ہنوز سکونت پذیر ہیں تو پھر اس قلیل تعداد کے بدلے ساڑھے چار لاکھ کی بڑی آبادی کو غیر ملکی ہونے کے سلسلے کا نوٹس جاری کر کے ہراساں کرنے کا کیا مطلب ہے ۔

دار السلطنت دہلی میں بھی 37 ہزار مسلمانوں کے ناموں کے انتخابی لسٹ سے ہٹائے جانے کی خبر آچکی ہے جس سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے درمیان سخت بے چینی اور تشویش پائی جاتی ہے ۔ تقریباً دو سال قبل بی جے پی کی اوکھلا کے علاقوں میں بسی ہوئی مسلم آبادیوں کے خلاف اعلان جنگ کی تھی جو پوسٹر چھپا تھا وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی ۔ خوش قسمتی یہ کہئے کہ اوکھلا کے

ان مسلم رائے دہندگان کی علاقہ وار تعداد جنکو شہریت ثابت کرنے کا نوٹس دیا گیا

باندرہ	7008
امبولی اندھیری	40206
اندھیری	28252
کانڈی ولی	14401
بوری ولی	422
گھاٹ کوپر	6644
نہرو نگر	10312
سانتا کروز	17765
ملاڈ	20104
ٹرامبے	24728
کرلا	32422
بھانڈوپ، ملند، چمبور	45000
دندوشی	25000
پائیدھونی	8000

(فرحان حنیف ۔ بمبئی)

قرب و جوار کے چند سلجھے ہوئے اور باشعور برادران وطن اور دوسرے مسلم حضرات کی حکمت عملی و تدبر اور بروقت اقدام سے یہ آفت ٹل گئی اور دہلی بھی بچنے سے بچ گیا اس سلسلے میں سپریم کورٹ کے فعال و جواں وکیل محمد ساجد کا بڑا ہاتھ ہے انہوں نے اس علاقے کے ایک سابق ایم پی کی جانب سے پرزور انداز میں دہلی کے ہائی کورٹ میں مقدمہ پیش کیا ۔ جب بی جے پی کے رہنماؤں کے وکیل کی جانب سے یہ کہا گیا کہ یہ معاملہ عدالت کے حدود سے باہر کا ہے تب عدالت عالیہ کے ججوں نے صاف طور پر اپنے فیصلے میں یہ کہا کہ جب کسی علاقے کا امن و سکون خطرے میں ہو اور اس کے شہریوں کے جان و مال پر حملے کی بات ہو رہی ہو تو جج حضرات ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے ۔

الیکٹورل فارم کے اس عمل کے شروع ہونے کے بہت پہلے سے غیر ملکی شہریوں کے نام پر پریشان و ہراساں کرنے کا سلسلہ اس ملک میں جاری ہے تقریباً بارہ سال قبل نیلی میں جو قتل عام ہوا تھا وہ بھی اسی سے جڑا ہوا تھا اور ابھی حال میں آسام کے چند دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کو اس الزام کی قیمت بھی چکانی پڑی ہے ۔ بہار کے کٹیہار، کشن گنج اور پورنیہ اضلاع میں یہ بڑا ہی سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے ۔ ان علاقوں میں شیر شاہ سوری کی فوج کے کچھ خاندان کے افراد بسے ہوئے بتائے جاتے ہیں جنہیں اسد آبادی مسلمان کہا جاتا ہے کٹیہار کے ممبر پارلیامنٹ محمد یونس سلیم کے مطابق یہ وہ حضرات ہیں جو شیر شاہ سوری کے زمانے سے ان علاقوں میں آباد ہیں کئی سو سالوں سے ان کے نام سے زمین کے کاغذات، سرکاری رسیدیں اور دیگر کاغذات پائے جاتے ہیں جو کہ ان کے شہری ہونے کا بہترین ثبوت ہیں ۔ یونس سلیم صاحب ان لوگوں کی شہریت پر سوال کرنے کو سازش قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پورے علاقے اور کم از کم میرے حلقے میں ایک بھی غیر ملکی غیر قانونی طور پر نہیں ہے ستم ظریفی تو یہ ہے کہ کشن گنج میں ڈاکٹر سید حسن کے مثالی سیکولر تعلیمی ادارہ انسان اسکول و کالج کو بھی بعض حلقوں کی طرف سے غیر ملکی گھس پیٹھیوں کا اڈہ بتایا گیا ۔

یہ دستور ہند کے ساتھ مذاق نہیں تو کیا ہے کہ 47 سال گزر جانے کے بعد بھی اس ملک کے حقیقی شہریوں کو اس بات کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی شہریت کو ثابت کریں شہریت ثابت کرنے کے سلسلے میں جو بات کی جا رہی ہے یہ کاغذات تو آج سے دو ڈھائی سال قبل دہلی کے ان شہریوں کے پاس تھے جنہیں بنگلہ دیشی کہہ کر پکارا گیا اور یہاں سے رخصت کر دیا گیا ۔

انکے پاس ہندوستانی پاس پورٹ اور راشن کارڈ اور دوسرے کاغذات بھی تھے لیکن انہیں دہلی سے " نو مینس لینڈ میں بھیج دیا گیا ہے اور دوسرے حکومت بنگلہ دیش بھی انہیں سرحد کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے رہی ہے وہاں انہیں بنگلہ دیش رائفل فورس کی بندوقوں کی نوک کا سامنا ہے ۔

تعجب تو یہ ہے کہ اس افسوسناک عمل پر ملک گیر پیمانے پر احتجاج ہوتا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا مرکزی وزیر سیتا رام کیسری کانگریس اقلیتی سیل کے طارق انور اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے لیڈر اندر جیت کے علاوہ کسی قابل ذکر لیڈر یا سیاسی جماعت کے نزدیک یہ مسئلہ اہمیت کا حامل نہیں ہو سکا ۔ آج صورتحال یہ ہے کہ یہاں کی سب سے بڑی اقلیت کے افراد جو کل تک پاکستانی ایجنٹ کہلاتے تھے آج ان کی شہریت بھی سوالیہ نشان بن رہی ہے ۔

کاسابلانکا کی معاشی تعاون کانفرنس کی آڑ میں امریکہ و اسرائیل کی

مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کو معاشی غلام بنانے کی سازش

حال ہی میں مراکش کے تاریخی شہر کاسابلانکا میں عرب و اسرائیلی حکمرانوں اور دنیا کے کئی سو سیاستدانوں، تاجروں اور ماہرین معاشیات کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار اسرائیلی لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ چونکہ اس کانفرنس سے اسرائیل کو سیاسی، سفارتی اور معاشی

کیا عربوں میں ایسے ماہرین معاشیات، تاجر اور اہل صنعت نہیں ہیں جو آزادانہ انداز میں سوچ سکیں، آخر وہ ہمیشہ مغربی تجربات پر کیوں بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ وہ خود اپنی ضروریات کے مطابق نئے طریقے ایجاد کریں اور اہل مغرب کے تجربات پر تکیہ کرنا بند کردیں۔

سطح پر بہت کچھ مل رہا تھا اس لئے اس کے وزیر اعظم، وزیر خارجہ کئی اور کیبنٹ منسٹروں کے علاوہ بہت سے تاجروں نے بھی اس میں شرکت کی۔ کانفرنس کا ظاہری مقصد تو مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں معاشی تعاون کو فروغ دینا تھا لیکن یہ دراصل اس امریکی و اسرائیلی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پہلا قدم تھا جس کے مطابق وہ پورے مغربی ایشیا و شمالی افریقہ کو اپنی معاشی مارکیٹ میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ و اسرائیل دونوں ہی اس کانفرنس کے انعقاد اور اس کے نتائج سے بہت خوش ہیں۔ دونوں ہی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ معاشی استحکام اور تعاون سے علاقے سے کشیدگی ختم ہوگی اور باہمی امن و مفاہمت کو فروغ ملے گا۔ مغربی ماہرین بڑی خوشی سے یہ پیشگوئی کر رہے ہیں کہ مغربی ایشیا ایک زبردست مارکیٹ بننے والا ہے۔ یعنی اب جب کہ عرب اچھے اور سمجھدار "(Good Guys)" ہیں تو اس علاقے میں باہری فنڈ بھاری مقدار میں آئے گا جو پہلے سے موجود فنڈ کے ساتھ مل کر اس خطے کے صحراؤں کو ہرا بھرا کرنے کے ساتھ اسے ایک نئے صنعتی انقلاب سے بھی روشناس کرائے گا۔

لیکن عربوں کو اپنے آپ سے یہ سوال ضرور پوچھنا چاہیے کہ کیا انہیں ہمیشہ دوسرے خصوصا مغربی ماہرین ہی یہ بتائیں گے کہ ان کے مفادات کیا ہیں، یا انہیں کس قسم کے معاشی پروگرام یا طرز حکومت کو اختیار کرنا چاہیے؟ پچھلے 40 سالوں سے عربوں سے اہل مغرب یہ کہتے رہے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے؟ اور اب وہ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا رہا ہے یا کہا جا رہا ہے، اسے عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا عربوں میں ایسے ماہرین معاشیات، تاجر اور اہل صنعت نہیں ہیں جو آزادانہ انداز میں سوچ سکیں؟ آخر وہ ہمیشہ مغربی تجربات پر کیوں بھروسہ کرتے ہیں؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ وہ خود اپنی ضروریات کے مطابق نئے طریقے ایجاد کریں تاکہ ان کا اپنا بھلا ہو، کیونکہ دوسروں کے خصوصا اہل مغرب کے "مشورے" ہمیشہ نہ تو مخلصانہ ہوتے ہیں اور نہ عربوں کے مفادات میں۔

عربوں کو جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے سبق لینا چاہیے۔ جاپان کی معاشی ترقی کے گہرے مطالعے سے خصوصا یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ معاشی ترقی اور جدیدیت میں فنڈ سے بھی کہیں زیادہ اہم رول وہ تربیت یافتہ انسان کرتے ہیں جنہیں خاص ایسے ہی مقاصد کے حصول کے لئے بڑی محنت سے تیار کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی وسائل کا فروغ معاشی ترقی کے لئے بہت زیادہ اہم ہے۔ جاپان کے پاس وسائل بہت کم ہیں مگر اس کے پاس ایسے افراد ہیں جو کامیابی کا راز جانتے ہیں۔ وہ اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہیں تاکہ کامیاب ہوں۔ یاد رکھیں کہ کامیابی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ کامیابی خصوصا ان لوگوں کو کبھی بھی نہیں ملتی جو کام کرنے کے بجائے نعرے بازی، خود ستائی یا اپنے شاندار ماضی کا گن گانے میں مصروف رہتے ہیں۔

عربوں میں یہ مرض عام ہے کہ وہ اکثر اپنی ہی تعریف میں زبان تر کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح بعض لوگ صرف شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔

کانفرنس کا ظاہری مقصد تو مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں معاشی تعاون کو فروغ دینا تھا لیکن یہ دراصل اس امریکی و اسرائیلی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پہلا قدم تھا جس کے مطابق وہ پورے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کو اپنی معاشی مارکیٹ میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔

یہاں یہ مقصود نہیں ہے کہ لوگ اپنے ماضی کو سرے سے بھول جائیں یا نظر انداز کر دیں۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ ماضی کی طرح حال بھی بہت اہم ہے کیونکہ جب تک کسی قوم کو اپنی موجودہ حالت کا صحیح علم نہ ہو وہ ایک بہتر مستقبل کی طرف سفر کا آغاز نہیں کر سکتی۔

عرب ایک زمانے سے اپنی تکنیکی اور تعلیمی ضرورتوں کے لئے مغرب کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔ امریکہ اور مغرب نے اس ضمن میں انہیں اپنے "مشوروں" اور "تجربوں" سے نوازا بھی مگر اس کے باوجود عربوں کو کامیابی نہیں ملی، یہاں تک کہ اب 21 ویں صدی کا آغاز بہت قریب ہے، مگر عرب زبردست وسائل پر قابض ہونے کے باوجود بھی پسماندہ ہیں۔

آج عربوں کو بہت سارے سیاسی، معاشی، تعلیمی اور دفاعی مسائل کا سامنا ہے۔ عرب بے شمار دولت کے باوجود غذائی (Food Security) درجہ نہیں حاصل کرسکے ہیں ان کے آبی وسائل بتدریج ختم ہو رہے ہیں، ماحولیاتی آلودگی اور صحت کے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ان کے پاس ایسا تعلیمی نظام نہیں ہے جو ایسے ماہر افراد پیدا کرے جو جدید دنیا میں رہنے والے عوام کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

جاپان کی موجودہ ترقی میں تعلیم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جاپان نہ تو اپنی تجارتی صلاحیت کے لئے مشہور تھا اور نہ صنعتی و تکنیکی مہارت کے لئے۔ مگر تعلیم نے سب کچھ بدل دیا اس نے مغربی سائنس و ٹکنالوجی پر عبور حاصل کیا ان کے صنعتی نظام کا مطالعہ کیا اور پھر اپنی ضروریات کے مطابق نئے طریقے اور چیزیں ایجاد کیں۔ تعلیم نے انسانی وسائل کے فروغ میں بے انتہا مدد کی اسی کے ساتھ جاپانی تبدیلی سے خوفزدہ نہیں تھے بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق انہوں نے تبدیلی کو قبول کیا۔ عوام کے اندر ایسی تبدیلیوں کو قبول کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ کسی نے یہ تبدیلیاں ان پر تھوپی نہیں۔ جاپان کے عوام اور ان کی لیڈر شپ دونوں نے مل کر کام کیا۔ ایسا نہیں کہ ان کے درمیان بعض مسائل یا تبدیلیوں سے متعلق اختلافات نہیں تھے۔ مگر دوسرے بہت سے ممالک کے برخلاف ان کے اختلافات نے تشدد کو جنم نہیں دیا۔ ان سب عوامل نے مل کر جاپان کو وہ کچھ بنا دیا جو وہ آج ہے۔ یعنی ایک ایسا ملک جو موجودہ دنیا کے رقبے کے 0.3 فیصد علاقے پر قائم ہے اور جس کا حصہ دنیا کی آبادی میں صرف تین فیصد ہے، مگر اس کے باوجود دنیا کی پیداوار "(Gross National Product)" میں ان کا حصہ 15 فیصد ہے۔

یہ کارنامہ اس ملک نے انجام دیا ہے جو دوسری جنگ میں پوری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ مگر آج وہ معاشی اعتبار سے دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہے۔ عرب جو گوناگوں وسائل سے مالا مال ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ کیا جاپان کی ترقی میں ان کے لئے کوئی سبق مضمر ہے۔

بقیہ: حماس کی دھمکی

ہیں حماس کے لوگ یوتھ کلب، کلینک، اسکول چلانے کے علاوہ دوسرے سماجی کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کے نقطہ نظر میں ایک تسلسل بھی ہے۔ وہ شروع ہی سے کہتے رہے ہیں کہ نام نہاد امن معاہدہ دراصل فلسطینیوں کے ساتھ ایک خیانت ہے۔ وہ یہ الزام بھی لگاتے رہے ہیں کہ یاسر عرفات نے عربوں کے دشمن اسرائیل سے محض ہاتھ نہیں ملایا ہے بلکہ اپنے ذاتی سیاسی مفادات کے لئے سارے فلسطینیوں کا اسرائیل سے سودا کر لیا ہے۔ غازہ میں فلسطینی مظاہرین پر پی ایل او پولس کی فائرنگ نے حماس کے انداز فکر کو تقویت پہونچانے کے ساتھ عرفات کو سیاسی سطح پر بیحد کمزور کر دیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ حماس میں موجود سیاسی بصریت رکھنے والے قائدین نے یاسر عرفات کی کمزوری کو محسوس کر لیا ہے۔ چنانچہ القسام بریگیڈ کے سرفروشوں کے انتقام لینے کی دھمکیوں کے برعکس انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں سے لڑنے کے بجائے اسرائیل کے خلاف حملے جاری رکھیں گے۔

حماس کی روپوش

قیادت نے بھی ایک پمفلٹ کے ذریعہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حماس نے اپنی فوجی ونگ کے جانبازوں سے اپیل کی ہے کہ شہیدوں کا بدلہ لینے کے لئے یہودی باز آبادکاروں اور اسرائیلی فوجیوں پر حملہ کریں۔ حماس اور اسکی فوجی ونگ کے درمیان یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ سرگرم سیاسی قائدین اور مجاہدین گرفتاریوں سے بچنے کے لئے روپوش ہیں جسکی وجہ سے ان کے درمیان براہ راست رابطہ قائم نہیں ہے۔ لیکن بالآخر ہوگا یہی کہ یاسر عرفات کو سیاسی طور پر مزید کمزور کرنے کے لئے حماس، اسکی فوجی ونگ اور اسلامی جہاد کے کارکن فلسطینی پولس کے بجائے اسرائیلی فوجیوں اور باز آبادکاروں کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں گے۔ ●

بقیہ: ملی پارلیامنٹ

خصوصی کمیٹی کی تشکیل کا مشورہ بھی سامنے آیا۔

پروگرام کے خاتمے تک عام شرکاء کا یہ احساس تھا کہ بابری مسجد کا مسئلہ، پرسنل لاء کی لڑائی یا اس طرح کے دوسرے مسائل دراصل دشمنوں کے پیدا کردہ ایجنڈے ہیں جن پر امت بغیر سوچے سمجھے گذشتہ نصف صدی سے اپنی قوت ضائع کرتی رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی ترجیحات خود منتخب کریں اور ان کاموں پر اپنی توجہ صرف کریں جس کے کرنے سے ہندوستان میں اسلام کے روشن مستقبل کی ضمانت ملتی ہو۔

شرکاء کے مسلسل اصرار کے باوجود نہ تو اس سات روزہ غور و فکر کے درمیان کوئی باقاعدہ لکچر ہوا اور نہ ہی ملی پارلیامنٹ کے لٹریچر تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ آخری مجلس میں جب شرکاء نے یہ شکایت کی کہ ہمیں ملی پارلیامنٹ کے لٹریچر اور قائد ملی پارلیامنٹ کی کتابوں سے استفادہ کا موقع فراہم نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس دوران قائد ملی پارلیامنٹ کے لکچر سے استفادے کا موقع ملا تو اس کے جواب میں اپنی آخری گفتگو میں قائد نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہماری کتابیں دین کے بارے میں ہماری اپنی تفہیم کا نتیجہ ہیں جو بہر طور ناقص ہے۔ ہم اس ناقص تفہیم کی بنیاد پر کوئی جماعت بنانا نہیں چاہتے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو امت میں ایک اور جماعت کے اضافے کا سبب ہوں گے۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہیکہ امت کو اپنے لٹریچر پر مجتمع کرنے کے بجائے کتاب اور سنت پر مجتمع کریں۔ آج اس کے اوپر جو سب سے بڑا عذاب ہے وہ یہ کہ امت خانوں میں بٹی ہوئی ہے کوئی شیعہ ہے تو کوئی سنی، کوئی حنفی ہے تو کوئی مالکی، کوئی مقلد ہے تو کوئی غیر مقلد۔ ہم اس ساری شناخت کو ختم کر کے اس امت کا رشتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑ دینا چاہتے ہیں۔ یعنی ہماری شناخت کے لئے صرف محمد صلعم کا پیرو ہونا ہی کافی ہو۔ اگر کوئی آپ سے یہ پوچھے کہ آپ کون ہیں؟ تو آپ کا جواب ہونا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنی پیرو اور اس اعتبار سے ہماری شناخت وہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت تھی یعنی مسلمان۔ نہ اس سے ایک انچ کم نہ زیادہ۔ قائد ملی پارلیامنٹ نے کہا کہ ملی شناخت کی تشکیل نو کا کام جب تک نہیں ہوتا امت کو ایک انقلابی پیغام پر مجتمع کرنا بہت ہی مشکل ہوگا اور اس سخت اور مشکل کام کے لئے ہمیں تاریخ کے ان انحراف کو عبور کرنا ہوگا جو پچھلے تیرہ سو سال میں ہماری شناخت میں در آئے ہیں۔ ملی پارلیامنٹ دراصل اس عظیم شناخت کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہی ہے یاد رکھئے ہم صرف اور صرف مسلمان ہیں اور کچھ نہیں کہ اس میں ہماری قوت کا راز پوشیدہ ہے۔ ملی پارلیامنٹ اگر کسی مرحلے میں ملت کے اندر ایک نئی شناخت کے قیام کی کوشش معلوم ہوتی ہے تو ہم اسے تحلیل کرنے میں توقف نہیں کریں گے۔

کیسی ہے یاسر عرفات کی ازدواجی زندگی

صحی تاویل عرفات ازدواجی زندگی اور دوسرے مختلف مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں

یاسر عرفات کی اہلیہ صحی تاویل 1963 میں یروشلم میں پیدا ہوئیں۔ وہ نابلوس کی ایک اعلی عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنے والدین کی پانچ اولادوں میں سے چوتھی ہیں۔ جب وہ بارہ برس کی ہوئیں تو ان کا خاندان نابلوس سے مقبوضہ علاقے کے رااملہ میں آکر سکونت پذیر ہوگیا۔ ان کے والد ایک بینکر تھے اور ان کی والدہ ایک معروف قلم



صحی اور عرفات۔ "مجھے ایک بیوی کے تمام حقوق حاصل نہیں ہیں"

کار صحافی ہیں۔ صحی نے پیرس سے پولیٹیکل سائنس میں تعلیم حاصل کی ہے۔ پیش ہے ان کا ایک تازہ ترین انٹرویو۔

سوال: آپ کی شادی سے قبل ہی لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ یاسر عرفات نے فلسطینی کاز سے شادی کر رکھی ہے ایسی صورت میں آپ ان کی دوسری 'بیوی' کے ساتھ کہ جس کے ساتھ یاسر عرفات کا تعلق زیادہ گہرا ہے، کیسے نباہ کرتی ہیں؟

جواب۔ اگر کوئی یاسر عرفات سے شادی کر لے اور ان کے ساتھ زندگی گزارنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچا فلسطینی ہے۔ آپ کو

ابو عمار ہمیشہ میٹنگوں میں مصروف رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح کے پانچ بج جاتے ہیں۔ ہم لوگوں کی کوئی ذاتی زندگی نہیں ہے کیوں کہ فلسطینی عوام ان سے ایسے ملتے ہیں جیسے کہ وہ غیر شادی شدہ شخص ہوں مجھے بیوی کی حیثیت سے تمام حقوق حاصل نہیں ہیں پھر بھی میں ان کے ساتھ خوش ہوں

فلسطینی عوام کی پریشانیوں، مصیبتوں اور ان کی خواہشات کا علم ہونا چاہیے۔ بحیثیت فلسطینی اسرائیلی قبضہ کی صورت میں جو اذیتیں مجھے جھیلنی پڑی ہیں ان کے پیش نظر میں ان کی دوسری "اہلیہ" کو بخوبی سمجھ سکتی ہوں اور اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں۔

سوال: لیکن ایسی صورت میں آپ معمول کی ازدواجی زندگی کیسے گزارتی ہیں۔

جواب۔ معمول کی ازدواجی زندگی تو سراسر عنقا ہے میں کسی بھی دوسری عورت کے لئے اس طرح کی ازدواجی زندگی کا تصور نہیں کرسکتی۔ میرے شوہر ہمیشہ میٹنگوں میں مصروف رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح کے پانچ بج جاتے ہیں۔ لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ اس قربانی کے پیچھے فلسطینی کاز میں بے پناہ یقین اور اعتقاد کی کار فرمائی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ ابو عمار کے ساتھ رہنا اور قربانیاں دینا بھی کار آمد ہے۔

سوال: آپ کی شادی کب ہوئی اور کیا آپ اس شادی سے خوش ہیں؟

جواب۔ جی ہاں! میں ابو عمار کے ساتھ بالکل خوش وخرم ہوں میں انہیں پانچ برسوں سے جانتی ہوں، اور ہماری شادی 17 جولائی 1990 کو ہوئی۔ ان کے ساتھ کام کرنے سے قبل ہی ہم لوگوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ دراصل ان کے ساتھ میرے کام کرنے کا مقصد ہم دونوں کا ایک دوسرے کو بہتر طریقے سے جاننا تھا۔

سوال: آپ گھر پر ازدواجی اور سیاسی زندگی میں امتیاز کیسے کرتی ہیں؟

جواب۔ یاسر عرفات جس وقت مصری فوج میں تھے اسی وقت سے ان کے خون میں فلسطینی کاز شامل ہے ان کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا انتہائی مشکل ہے فلسطین تو ہماری روزانہ کی زندگی ہے، دفتر میں گھر پر اور کھانے کے وقت بھی۔ یہاں تک کہ اکثر پانچ بجے صبح کسی ایمر جنسی میٹنگ کے لئے فون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے، ان کی کوئی ذاتی زندگی سرے سے ہے ہی نہیں۔

سوال: کیا آپ واقعی ان کے ساتھ رہتی ہیں؟

جواب۔ یہ تو آپ ان سے دریافت کیجیے۔ ابو عمار ہمیشہ کہتے ہیں "میرے خدا تو اس زندگی کی لئے ہمیشہ اس کی مدد کر" اب میں نے سمجھا کہ انہوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تھی۔ دراصل وہ کسی عورت کی تکلیف دہ زندگی کا سبب بننا نہیں چاہتے۔

سوال: آپ نے سب سے پہلے ان کے متعلق کب سنا تھا؟

جواب۔ جب میں پانچ سال کی تھی اور ہم لوگ نابلوس میں رہتے تھے۔ اسرائیلی فوجی لیڈر موشے دایاں کو ان کی تلاش تھی اس وقت ابو عمار ابو محمد کے نام سے جانے جاتے تھے اور انہوں نے اسرائیلی فوجیوں کے خلاف ایک کمانڈرو آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت گھر گھر اور گلی گلی ان کی تلاش ہو رہی تھی ہمارے گھر کی بھی تلاشی لی گئی تھی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اس شخص کی بیوی بنوں گی جس نے ہم لوگوں کی زندگی میں خوف ودہشت پیدا کر رکھا ہو اور جس کی تلاش میں اسرائیلی فوجی ہمارے خاندان والوں اور پڑوسیوں کو بھی ختم کرسکتے ہوں۔

سوال: آپ نے ابو عمار کی معاون کی حیثیت سے کیسے کام کرنا شروع کیا؟

جواب۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنے سے پہلے سے ہی ہم لوگوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا علم صرف چند افراد کو تھا۔ تعلقات کو مزید پختہ بنانے کی غرض سے ہی میں نے ان کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن تعلقات میں استحکام 1989 میں پیرس میں ملاقات کے دوران اس وقت پیدا ہوا جب انہوں نے مجھ سے اپنے ساتھ کام کرنے کو کہا تھا تا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہتر طریقے سے جان سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔

سوال: کیا آپ کو اس سلسلے میں کبھی کسی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا؟

جواب۔ بالکل کرنا پڑا اور سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور میں اس کو سمجھتی ہوں۔ فلسطینی عوام ان سے ایسے ملتے ہیں جیسے کہ وہ ایک غیر شادی شدہ شخص ہوں اور اپنا پورا وقت فلسطینی کاز کے لئے وقف کرچکے ہوں اور ہر فلسطینی ابو عمار کو اپنا سمجھتا ہے۔ میں اس بات کو محسوس کرتی ہوں اور اسے پسند کرتی ہوں۔ اس لئے میں نے ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کی۔

سوال: کیا آپ ان کی زندگی میں آئی ہوئی پہلی خاتون ہیں؟

جواب۔ شادی کے تعلق سے اگر دیکھا جائے تو یقینا میں پہلی خاتون ہوں، تاہم وہ ایک معروف شخصیت ہیں اور ان کی زندگی میں دوسری خواتین کا آنا کوئی بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔

سوال: کیا وہ گھر کے معاملات میں بھی اسی طرح انقلابی رہتے ہیں جیسا کہ اپنے کام کے تعلق سے ہوتے ہیں؟

جواب۔ نہیں گھر میں وہ بالکل پر سکون رہتے ہیں۔ میاں بیوی کی حیثیت سے کسی مسئلے پر تبادلہ خیال اور گفتگو کرنے کا موقع ہم لوگوں کے پاس نہیں ہوتا۔ ابو عمار کی شخصیت کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات میں بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں، اللہ سے ان کے روابط گہرے ہیں، وہ نماز پڑھتے ہیں اور جب فلسطینیوں کے زخمی ہونے یا ان کی اموات سے بہت زیادہ رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں اور ان کا دل درد سے بھر آتا ہے یا جب وہ کسی سیاسی یا معاشی بحران میں گرفتار ہوتے ہیں تو بہت زیادہ نماز اور قرآن پڑھتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اسی گہرے ربط اور تعلق کی بنا پر ہی وہ اپنے اوپر ہوئے چالیس سے زائد قاتلانہ حملوں میں بھی محفوظ و مامون رہے ہیں۔

سوال: 13 ستمبر 1993 کو جب انہوں نے واشنگٹن میں اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کیے تھے تو اس وقت کے حالات پر آپ کس طرح روشنی ڈالیں گی؟

جواب۔ میرے اور ابو عمار کے لئے اس وقت بھی صورت حال جوں کی توں تھی وہ معمول کے مطابق پرسکون تھے نماز ادا کرتے تھے اور قرآن پڑھتے تھے۔ وہ کسی قسم کے تناؤ میں ہرگز مبتلا نہیں تھے۔ اپنے کاز میں یقین اور اعتماد کے ساتھ وہ دستخط کرنے گئے تھے۔ اس وقت وہ کسی بھی خوف وہراس میں گرفتار نہیں تھے۔

سوال: اس نازک موقع پر کیا آپ نے انہیں کوئی مشورہ دیا تھا؟

جواب۔ اس وقت خاموشی سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ فلسطین کے کاز کے لئے پریشان تھے اور ایسے موقع پر انہیں کوئی مشورہ دینا میرے نزدیک غیر دانشمندی کی بات ہوتی۔

ساتھ کام کرنے سے پہلے ہی ہم لوگوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا جسکا علم صرف چند لوگوں کو تھا۔ ساتھ کام کرنیکا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریقے سے جان لیں اور زیادہ قریب آسکیں...

سوال: اس موقع پر آپ نے یاسر عرفات کے ساتھ واشنگٹن نہ جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

جواب۔ ایسے وقت میں جب کہ ہمارے آدمی مارے جارہے تھے، انتفاضہ کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور اسرائیلی جیلوں میں فلسطینی قیدیوں پر روزانہ مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے، ان کے ساتھ واشنگٹن جانا اور مسز رابن کے ساتھ کھڑے ہونا میرے خیال میں بہت ہی نا معقول بات ہوتی، اسی لئے میں نے اس موقع پر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سوال: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ صحی تاویل عرفات ایک اعلی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور مغربی یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہیں اس لئے وہ اپنے آدمیوں کو نہ تو بہتر طریقے سے جان سکتی ہیں نہ ہی ان کے قریب آسکتی ہیں اور نہ ہی ان کے مسائل سے واقف ہو سکتی ہیں؟



صحی اپنی والدہ کے ہمراہ

جواب۔ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے لوگوں کے قریب نہیں ہو سکتے اور ان کے دکھ درد کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ اس کے برعکس اگر آپ دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اپنے لوگوں کو جاننے اور ان کے دکھ درد میں ان کی مدد کرنے کے تعلق سے بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔

سوال۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ابو عمار کے ساتھ زندگی گزارنے میں آپ کو تمام حقوق حاصل ہیں۔

جواب۔ نہیں مجھے ایک بیوی کے تمام حقوق حاصل نہیں ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ایک سربراہ اور ایک جنگ جو کے ساتھ بحیثیت بیوی رہنا بذات خود ایک خاص قسم کی زندگی گزارنا ہے۔ جب وہ گھر ہوتے ہیں تو میں انہیں اپنا پورا وقت دیتی ہوں لیکن جب وہ باہر ہوتے ہیں تو میں اپنی مصروفیات میں مشغول ہو جاتی ہیں۔

بقیہ: دانتوں میں فلورائڈ

چند نمونوں میں فلورائڈ کی مقدار کی جانچ کی بنیاد پر کوئی عمومی فیصلہ دے دینا خاص گمراہ کن طریقہ ثابت ہوا ہے۔ اس نزاکت کے پیش نظر حکومت نے ابھی حال ہی میں اس علاقے میں واقع تمام آبی وسائل کی جانچ کے بعد فلورانڈش کے خاتمے کی پروجیکٹوں کی منظوری دی ہے۔ اس اقدام سے پینے اور کھانا پکانے میں صاف اور بہتر پانی کا استعمال ممکن ہو سکے گا۔ فلوریسس کے پھیلنے میں جن چیزوں کا بڑا ہاتھ ہے وہ ہیں اندھا دھند کھدائی، پانی کے معیار و نوعیت سے یکسر ناواقفیت اور وہ بے بنیاد خیال کہ زیادہ گہرائی سے نکالا ہوا عام ذرائع والا پانی محفوظ اور بہتر ہوتا ہے۔

جہاں تک فلورانڈش ختم کرنے کا سوال ہے تو اننت پور (آندھرا پردیش) کی سری ست سئی انسٹیٹیوٹ آف ہائر سرتنگ کے ماہرین نے مخصوص فلٹر تیار کیے ہیں کیوں کہ اس سے پہلے مستعمل تمام فلٹر اور پانی ابالنے کے طریقوں سے کلورانڈش ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ نیشنل انوائرنمنٹ انجنیرنگ ریسرچ انسٹیٹیوٹ ناگپور نے ایک ٹکنک ایجاد کی ہے جس کے تحت پانی کو چونا، پھٹکری اور بلیچنگ پاوڈر کے مرکب سے تیزی کے ساتھ گزارا جاتا ہے۔

کیا پاکستان کی نئی پہل

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں معاون ہوگی؟

اسلامی ممالک کی تنظیم او۔ آئی۔ سی کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کو بین اقوامی فورم پر اٹھانے کے نئے تہیہ اور ہندوستانی حکومت کی جانب سے کشمیر میں انتخابات کرانے کے شور وغوغے کے درمیان پاکستان کے وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے چھ متبادل فارمولے کے اعلان نے ہندوپاک کے سیاسی وسفارتی حلقے میں قیاس آرائیوں کے بازار کو گرم کردیا ہے۔ خود کشمیر میں مختلف حریت پسند تنظیموں اور جماعتوں کے مابین ان چھ متبادل پر زوردار چہ می گوئیاں جاری ہیں۔ بعض حلقوں میں اسے کشمیر کی آزادی کے نئے امکانات سے تعبیر کیا جارہا ہے تو بعض حلقوں میں اسے جموں وکشمیر کی تقسیم کا شاخسانہ تصور کیا جارہا ہے۔ لیکن پاکستانی وزیر خارجہ تفصیلی وضاحت یا صاف صاف اظہار کے بغیر ان چھ متبادل فارمولوں کے معلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن پاکستانی وزیر خارجہ کے بیانات سے مترشح مفہوم کی روشنی میں دونوں ملکوں کے سیاسی وسفارتی حلقوں میں کم از کم تین متبادل فارمولے واضح ہیں۔

چونکہ پاکستان کا مسلسل یہ اصرار رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی اس قرار داد کی روشنی میں ہی حل کیا جانا چاہیے۔ جو 1947 سے ہی التوا میں پڑا ہوا ہے اور جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ریاست میں

> **پاکستان کے وزیر خارجہ کے ذریعے پیش کردہ چھ متبادل میں سے ان تین متبادل کے ذریعہ کیا مسئلہ کشمیر کے حل کی سمت میں کوئی پیش رفت ہوگی یہ کہنا اس وقت بہت مشکل ہے لیکن جس بات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ پاکستان کی جانب سے مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کے ساتھ مشروط گفت وشنید کی خواہش کا اظہار ایک خوش آیند اشاریہ ضرور ہے۔**

معقول حالات پیدا ہوتے ہی استصواب رائے کے ذریعہ کشمیری عوام کی رائے معلوم کی جانی چاہیے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اپنا الحاق چاہیں گے یا پاکستان کے ساتھ ملحق ہونا پسند کریں گے۔ اور اسی رائے کی بنا پر کشمیری عوام اور ریاست کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان اس کو متنازعہ خطہ قرار دے کر وقتاً فوقتاً اس مسئلے کو بین اقوامی فورم پر اٹھاتا رہا ہے اور اقوام متحدہ کی قرار داد کی روشنی میں اسے حل کرنے کے لئے عالمی برادری کی حمایت حاصل کرنے کی کوششیں کرتا رہا ہے۔ جینوا میں منعقد انسانی حقوق کی بین اقوامی کانفرنس ہو یا گذشتہ دنوں نیو یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا سالانہ اجلاس یا پھر اسلامی ممالک کی تنظیم او۔ آئی۔ سی کے ذریعہ مسئلہ کشمیر پر اختیار کردہ موقف کے منصوبے میں مکمل کامیابی حاصل نہ ہوسکی ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسئلہ کشمیر اس وقت بین اقوامی سطح پر ایک توجہ طلب مسئلہ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آچکا ہے۔

لیکن اندرون کشمیر جس طرح کے حالات پیدا ہوچلے ہیں وہ پاکستان کے لئے تشویش کا باعث بھی ہیں، کیونکہ پاکستان کی یہ ساری کوششیں اس توقع کے تحت جاری ہیں کہ اگر کشمیری عوام کو استصواب رائے کا حق حاصل ہوگیا تو وہ کشمیر کے الحاق کو پاکستان کے ساتھ وابستہ کرنے میں بھی کامیاب ہوجائے گا۔

پاکستان کے وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کے چھ متبادل فارمولے کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ چونکہ تین متبادل ابھی صیغہ راز میں ہیں۔ لہذا ان کے متعلق تو اسی وقت اظہار خیال ممکن ہے جب وہ منظر عام پر آئیں گے۔ لیکن جن تین متبادل کی واضح نشاندہی سردار آصف احمد علی کے بیانات کی روشنی میں کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ:

اول یہ کہ یا تو کشمیری عوام کو حق استصواب حاصل ہو اور وہ پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا فیصلہ کریں۔

دوسرے یہ کہ جموں کشمیر کو منقسم کرکے کشمیر کا خطہ پاکستان کے حوالے کردیا جائے اور جموں کو ہندوستان کا حصہ رہنے دیا جائے۔

تیسرے یہ کہ کشمیر کو ایک خود مختار اور آزاد ملک کا درجہ عطا کردیا جائے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ کے ذریعہ پیش کردہ چھ متبادل میں سے ان تین متبادل کے ذریعہ کیا مسئلہ کشمیر کے حل کی سمت میں کوئی پیش رفت ہوگی یہ کہنا اس وقت بہت مشکل ہے لیکن جس بات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ پاکستان کی جانب سے مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کے ساتھ مشروط گفت وشنید کی خواہش کا اظہار ایک خوش آئند اشاریہ ضرور ہے۔ عین ممکن ہیکہ اقوام متحدہ کی قرار داد کو چھ متبادل طریقوں سے نافذ کرنے کے پاکستانی فارمولے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے آسکے جو نہ صرف ہندوپاک اور کشمیری عوام سبھی کے لئے قابل قبول ہو بلکہ مسئلہ کا پرامن اور پائدار حل بھی قرار پائے۔ ●

بقیہ: ندوۃ العلماء

تو وہاں موجود ہے اور نہ کوئی گرفتار ہوا اور نہ ہی کسی طالب علم پر اس طرح کا الزام ثابت ہوسکا ہے۔ اب تک نہ تو اس حملے کی مذمت کی ہے اور نہ ہی اس کے لئے ذمہ دار افسران کو جانچ کا حکم ہی صادر کیا ہے۔ خود دلی پولیس نے بھی اس حقیقت کی تصدیق کی ہے کہ انٹلی جینس بیورو جس خورشید نامی کشمیری دہشت گرد کی تلاش و گرفتاری میں ندوہ پر حملہ آور ہوئی وہ خورشید ایک مہینے قبل ہی غازی آباد میں اغوا شدہ غیر ملکی سیاحوں کو چھڑانے کے دوران ہوئی پولیس مڈبھیڑ میں مارا جاچکا تھا۔ اور بیورو کو اس کی اطلاع بھی تھی۔

مرکزی خفیہ ایجنسی انٹلی جینس بیورو کے افسران کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ حملہ مرکزی وزیر داخلہ چوہان کی ایما اور اجازت سے کیا تھا جب کہ مرکزی وزیر مملکت برائے داخلی امور راجیش پائلٹ کا یہ کہنا ہے کہ انہیں اس حملے کا قطعی علم نہیں تھا۔ دوسری جانب ریاست کی ملائم سنگھ حکومت نے مرکز سے اس بات پر احتجاج درج کرایا ہے کہ مرکز نے اس سلسلے میں ریاستی حکومت کو بالکل اندھیرے میں رکھا اور اس کو کوئی اطلاع نہیں دی بلکہ براہ راست دلی پولیس اور لکھنؤ کی مقامی پولیس اور بعض افسران سے رابطہ کرکے آدھی رات کو ندوہ پر حملہ کردیا۔ یہی سبب ہے کہ ملائم سنگھ نے لکھنؤ پولیس کے ان افسران کو معطل کردیا ہے جنہوں نے انٹلی جینس بیورو کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے بغیر اعلیٰ افسران اور انتظامیہ یا وزیر اعلیٰ کو مطلع کئے ندوہ پر حملے میں ان کا ساتھ دیا۔

بعض باخبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ مرکزی حکومت کی انٹلی جینس بیورو اور ریاستی انتظامیہ میں موجود آر۔ ایس۔ ایس نواز عہدے داران اور افسران کی ملی بھگت سے ندوہ پر حملہ کا منصوبہ انجام پذیر ہوا۔ کیونکہ بی۔ جے۔ پی اور آر ایس ایس نواز افسران ریاست میں کشیدگی اور مخالف لہر کا ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ملک میں ایک طرف ملائم حکومت کے لئے دشواریاں پیدا ہوں تو دوسری طرف مسلمانوں میں خوف و دہشت اور عوام میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار ہو۔ جس کا بھرپور سیاسی فائدہ بھاجپا کو پہنچ سکے۔

مرکزی حکومت اسکی وزارت داخلہ اور انٹلی جینس بیورو کے ذریعہ ندوہ کی بے حرمتی اور مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے اس رویے کی ملک گیری نہیں عالمی سطح پر بھی مذمت کی جارہی ہے۔

اس شب خوں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ریکٹر...... جناب ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) حفظہ اللہ کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ حملہ نہ صرف شرارت آمیز ہے بلکہ خطرناک منصوبے کا حصہ ہے۔ انہوں نے نہایت غصے کے لہجے میں یہ فرمایا کہ ہمارے ساتھ مجرم کی طرح ناروا سلوک کیا گیا ہے جبکہ اس ادارے کی شہرت عالمی سطح پر اپنا ایک وقار رکھتی ہے۔ اور جس کی وطن دوستی اور قوم پرستی کو کبھی انگشت نمائی کی کسی بات سے بھی نہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جس خورشید نامی دہشت گرد کو ساتھ کر ندوہ پر حملہ کیا گیا اس نام کا کوئی لڑکا نہ کبھی ندوہ میں زیر تعلیم تھا اور نہ ہی اس وقت ہے۔ انہوں نے اس حملے کو وطن پرست مسلمانوں پر ایک حملہ قرار دیا۔

لکھنؤ کے علاوہ علیگڑھ، دہلی، پٹنہ، بمبئی کلکتہ، حیدرآباد اور دیگر مختلف شہروں سے بھی دانشوروں اور مسلم تنظیموں اور اداروں نے بھی ندوہ پر اس حملے کی مذمت کرتے ہوئے مرکزی حکومت سے اس مسئلے پر مسلمانوں سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ملی پارلیمنٹ کے قائد ڈاکٹر راشد شاذ نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے اس حملے کی سخت مذمت کی اور کہا کہ آج ہر ہندوستانی مسلمان آئی ایس آئی کا ایجنٹ گردانا جارہا ہے۔ اور انہیں شک کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بابری انہدام ہندوستان میں ایک ایسا پولیس راج قائم ہے جہاں کسی بھی مسلمان کو کہیں بھی بلا وجہ گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ جو کہ ایک نہایت سنگین صورت حال ہے اور مسلمان اس صورت حال کو اب ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر شاذ نے بھی کہا کہ دیگر مسلم تنظیموں سے رابطے کے بعد ملی پارلیمنٹ اس مسئلے کو او۔ آئی۔ سی اور انسانی حقوق کمیشن جیسے بین اقوامی اداروں میں لے جائے گی۔ ●

بقیہ: بندوق کی گولی

پی ایل او اسرائیل امن معاہدے کے مخالف ہیں۔ کیونکہ امریکی واسرائیلی پروپیگنڈے کے زیر اثر شاید ساری دنیا انہیں دہشت گرد تصور کرتی ہے جنہیں ختم کردینا عین فلاح انسانیت ہے۔

لیکن مغربی ایشیا کی صحیح تصویر اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو امریکی یا اسرائیلی پیش کررہے ہیں۔ عرب امن معاہدوں پر اس لئے نہیں دستخط کررہے ہیں کہ ادھر اچانک ان کے دلوں میں امن کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ امن کے متلاشی رہے ہیں، مگر ایک باعزت اور مبنی بر انصاف امن جس پر وہ فخر کرسکیں۔ آج وہ اپنے دل سے نہیں بلکہ اس لئے "امن معاہدوں" پر دستخط کررہے ہیں کہ اسرائیل کے برعکس ان کی حمایت کرنے والا سپر پاور دنیا کے نقشے سے ناپید ہوگیا ہے سرد جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد امریکہ واسرائیل مغربی ایشیا پر ایک ایسا "امن" تھوپ رہے ہیں جو بہت سی عرب حکومتوں اور کروڑوں عربوں کی نظر میں توہین آمیز ہے۔

سب سے پہلے پی ایل او اسرائیل معاہدے پر نظر ڈالیں اس کے مطابق یاسر عرفات کو غازہ پٹی پر "حکومت" کرنے کا اختیار ملا جسے اسرائیلی انتفاضہ کے دوران اپنی طاقتور فوج کے باوجود کنٹرول نہیں کرسکے اس نام نہاد خود مختار علاقے میں موجودہ یہودی بستیوں کو ختم نہیں کیا جارہا ہے جو تناو کو برقرار رکھنے کا مستقل ذریعہ ہیں۔ اس کے برعکس مغربی کنارے اور یروشلم کو مقبوضہ علاقہ کے بجائے اسرائیلی یہاں تک کہ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ یا وزارت خارجہ بھی "متنازعہ علاقہ" کے نام سے پکارنے لگے ہیں جیسے واقعی اسرائیل ہی اس علاقے کا مالک ہے اور اب جہاں فلسطینیوں کو واپس آکر بسنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ خبر بھی گرم ہے کہ اسرائیلی اپنے اس قانون کو بدلنے والے ہیں جس کے مطابق ہر یہودی کو اسرائیل میں آکر آباد ہونے کا حق حاصل ہے تاکہ وہ فلسطینی اسی انداز پر کوئی قانون نہ بنا سکیں جو مقبوضہ علاقوں سے باہر ہیں اور جن کی تعداد غازہ پٹی اور مغربی کنارے کے فلسطینیوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اسی پر بس نہیں ہے۔ یاسر عرفات پر مسلسل دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ حماس کا خاتمہ کریں۔ اسرائیل وامریکی دباؤ کے زیر اثر یہ کام یاسر عرفات نے شروع بھی کردیا ہے جس کے نتیجہ میں 18 نومبر کو غازہ پٹی شہر میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اسرائیلی اسی پر بس نہیں کررہے ہیں بلکہ وہ یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ نام نہاد خود مختار علاقوں کے آئندہ انتخابات میں حماس کو شرکت کا حق نہ دیا جائے۔ ظاہر ہے ایسے اقدامات سے جن کے لئے یاسر عرفات کو مجبور کیا جارہا ہے، غازہ پٹی میں خانہ جنگی تقریباً طے ہوجائیگی۔ ایسا نہیں کہ اسرائیلی اور امریکی اس صورتحال سے واقف نہیں ہیں مگر یہ سب ان کی ایک اسکیم کے مطابق ہورہا ہے تاکہ اس خانہ جنگی کو بہانہ بنا کر مغربی اور یروشلم کو یہ کہہ کر نام نہاد خود مختاری نہ دی جائے کہ یاسر عرفات ایک "حکمراں" کے طور پر ناکام رہے ہیں۔

اردن نے بھی مجبوری میں امن معاہدہ کیا ہے۔ جنگ خلیج کے بعد اس کی معاشی حالت ابتر ہوچکی تھی۔ خطے میں کوئی دوست بھی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ شاہ حسین نے اپنے اس 40 سالہ عہد کو توڑ کر اسرائیل سے معاہدہ کرلیا جس کے مطابق اس نے اسرائیل سے یروشلم اور مغربی کنارے کو آزاد کئے بغیر سمجھوتہ نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

شام کی حالت بھی دگرگوں ہے، امریکہ بتدریج اس کے عرب حامیوں کو توڑ رہا ہے حافظ الاسد کو بھی ایک توہین آمیز معاہدہ پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ الغرض عربوں کی اس امید پر پانی پھرتا نظر آرہا ہے کہ وہ اسرائیل سے ایک باعزت معاہدہ کرسکیں گے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیل امن کے معاملے میں بھی اپنی من مانی کررہا ہے۔ باہمی مفاہمت اور تعاون کی بنیاد پر باوقار معاہدہ کرنے کے بجائے وہ اس خطے پر اپنی مرضی کا امن تھوپنا چاہتا ہے۔ مگر اسرائیل وامریکہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ناانصافی کی کوکھ سے کبھی پائدار امن جنم نہیں لیگا جو وہ عربوں کے ساتھ روا رکھنا چاہتے ہیں۔ ●

عصر حاضر کے چیلنجوں کا موثر جواب تعلیم

تعلیم کی روشنی کے بغیر مسلمانوں کا مستقبل تابناک نہیں ہوسکتا

تحریر: نجیب اختر

یہ کالم ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق مسلم و غیر مسلم دانشوروں کے مضامین کے لئے وقف ہے۔ اس میں مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کردہ نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ایڈیٹر)

غلام ہندوستان کی آزادی کے لئے جو جد وجہد اور قربانیاں دی گئیں ان میں مسلمان اپنے دوسرے ہم وطنوں سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ اور اپنے خون جگر سے اس سرزمین کی آبیاری کرتے رہے اور مستقبل کے لئے سنہرے خواب دیکھتے رہے اور منتظر رہے کہ آزادی کی آنے والی پہلی صبح ہمارے لئے نئی بشارتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگی لیکن آزادی کے 47 سال گزر جانے کے بعد جب ہم محاسبہ کرتے ہیں تو یہ سوال بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا واقعی ہمیں "آزادی" ملی؟

آزادی نے ہمیں کیا دیا؟ فسادات، بھوک، افلاس، تعلیمی اور معاشی پچھڑا پن، سماجی نابرابری اور امتیازات، ذلت و رسوائی، عزت و آبرو غیر محفوظ، یہاں تک کہ مذہبی مقامات بھی غیر محفوظ تعلیمی طور پر ہم سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں، ملازمت میں ہمارا تناسب روز بروز گھٹ کر صفر تک پہنچنا چاہتا ہے۔ تجارت میں بھی ہم سب سے پیچھے ہیں۔ آزادی کی نعمتوں میں ایک اور چیز ہمارے حصے میں آئی وہ ہے ٹاڈا جس کے سب سے زیادہ شکار ہم ہیں۔ ان دنوں ایک اور نسخہ ہمارے لئے تجویز کیا گیا اور وہ ہے آئی ایس آئی کا طوق جسے فوراً مسلمان کے گلے میں ڈالدیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیشی کے نام پر لاکھوں لوگوں کے نام ووٹر لسٹ سے خارج کرکے غیر ملکی قرار دے دیا گیا ہے۔ کشمیر میں دہشت گردی کے نام پر ہماری نسل کشی کا سلسلہ جاری ہے۔ غرض کہ آزادی کی چھاؤں میں کون سے گھاؤ ہیں جو ہم نے نہیں کھائے کون سی ایسی ذلت ہے جو ہم نے نہیں سہی۔ اس کے باوجود ہماری بے حسی بے قرار ہے۔

کیا ہم نے اس ہزیمت سے کوئی سبق لینے کی کوشش کی؟ کیا ہمارے اکابرین ملت اور دانشوروں نے کسی مشترکہ حکمت عملی پر غور وفکر کی زحمت گوارہ کی؟ ہم نے کوئی نکتہ اتحاد تلاش نہیں کیا۔ ہماری ایک اور سب سے بڑی کمی رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے ایک انبیائی امت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کیا۔ اپنی اہمیت اور حیثیت کو نہیں پہچانا ہمیشہ دوسروں کے سامنے کاسہ گدائی لئے رہے۔ ہم نے اپنی حیثیت ایک سوالی کی بنا رکھی۔ ہم نے اس بات کا احساس نہیں کرایا کہ اس ملک پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اوروں کا ہے۔

گذشتہ نصف صدی سے ہم صرف جذباتی نعروں اور خیالی منصوبوں کے سہارے زندگی گزارنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ اور ہم نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ہم نے یسائنٹفک نقطہ نظر کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ اب جب کہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔ سائنسی ترقیات نے ہمیں حیرت واستعجاب میں ڈال رکھا ہے۔ اور ہم ہیں کہ وہی لکیر کے فقیر۔ نہ کوئی منظم عملی منصوبہ بندی ہے اور نہ جہد وعمل کی کوشش ---- ہمیں اپنے رویے کو بدلنا ہوگا۔ اپنے انداز فکر ونظر میں تبدیلی لانی ہوگی "انقلابی تبدیلی"۔ تبھی ہم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور ایک نئی تاریخ مرتب کرسکتے ہیں، جس میں ہماری عظمت اور عزت ووقار کی داستانیں قلمبند کی جاسکیں گی۔

ہمیں جن امور کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ جذباتی، خوش کن اور بلند بانگ نعروں سے حل نہیں ہوسکتے۔ بہت ہی صبر آزما حوصلے اور تحمل کا کام ہے۔ اس سلسلے میں "تعلیم" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ اسے ہم تمام مسائل کی شاہ کلید کہہ سکتے ہیں۔ جس سے ہماری معاشیات اور اخلاقیات بھی جڑی ہوئی ہیں۔ تعلیم کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ عصر حاضر کے چیلنج کا جواب ہم تعلیم ہی کے ذریعے دے سکتے ہیں۔ لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کیسی ہو؟ اس کا معیار کیا ہو؟ یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ زمانہ برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ کمپیوٹر اور روبوٹ ہماری جگہ لے رہے ہیں۔ ایسے میں ہمیں وقت کی نبض اور رفتار کو پہچانتا ہے۔ عصر حاضر کے تمام علوم کو اپنانا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف خصوصی توجہ دینی ہے کیونکہ عصر حاضر کے یہ رائج الوقت سکے ہیں۔ ہمیں انہی میں کمال حاصل کرنا ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو اپنی لگن، انتھک محنت، اور جان توڑ کوشش کے ذریعہ اجاگر کرنا ہے اور مقصد کو پانے کے لئے اس انداز سے کوشش کرنی ہے کہ ہماری حیات اور موت کا سوال ہو اور ہماری کامیابی پر دوسرے رشک کریں اور ہم ان کے لئے ناگزیر بن جائیں اور ہمارے ساتھ چاہ کر بھی کوئی امتیاز نہ برتا جاسکے اور نہ کوئی ہمیں دبا سکے۔

> **گزشتہ نصف صدی سے ہم جذباتی نعروں اور خیالی منصوبوں کے سہارے زندگی گزارنے کے عادی ہوچکے ہیں. ہم نے سائنٹفک نقطہ نظر اپنانے کی کوشش کبھی نہیں کی. ہمیں اپنے انداز فکر ونظر میں انقلابی تبدیلی لانی ہوگی۔ جبھی ہم کوئی نئی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں.**

اس مقصد کے حصول کے لئے درج ذیل نکتوں پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

(1) ہمارے جو تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں ان کا نظام اور تعلیمی معیار بہت ہی پست اور ناقص ہے۔ بعض اوقات ہمیں ان کے وجود کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں قائم کئے گئے ہیں۔ اس طرح کی تعلیم تو ہمیں دوسرے اداروں میں بھی مل جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس معیار کے اداروں سے کسی بڑے نتیجے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اتنا بڑا مقصد ہم ان اداروں کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کے نظام کو چست اور معیار کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ضروت اس محنت لگن اور Devotion کی ہے جس سے ہم اپنے مطلوبہ مقصد کے حصول میں کامیاب ہوسکیں۔

لیکن اس راہ کی بڑی رکاوٹ ان اداروں کی انتظامیہ ہے جو عام طور پر کسی مثبت اور انقلابی تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے اثر اور اس کی مرکزیت میں کوئی حصہ دار بنے اس لئے اگر کسی گوشے سے کوئی تعمیری اور اصلاحی مشورے دیئے جاتے ہیں تو اس پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اس سلسلے میں اچھے اور باصلاحیت اساتذہ کا معاملہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اقلیتی ادارے کے سکریٹری یا ارکان عاملہ کے رشتہ داروں کو صلاحیت نہیں بلکہ تعلق اور رشتہ داری کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے اور ملت کے باصلاحیت افراد کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک سنگین جرم ہے اور ناقابل معافی ہے۔ ہم پوری آئندہ نسلوں کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوتے ہیں ایک جاہل اور بے صلاحیت ٹیچر عالم شاگرد پیدا نہیں کرسکتا اس لئے اچھے ٹیچر کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اس پر ہمارے مستقبل کا دارومدار ہے۔

> **ہمیں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دینی ہے کیوں کہ انھی کی گود میں مستقبل کی نسل کو پروان چڑھنا ہے. اگر ماں تعلیم یافتہ نہیں ہے تو اپنے بچے کی تعمیر سیرت میں بہتر رول ادا نہیں کر سکتی ...**

(2) ہمارے یہاں تعلیم کا دوسرا بڑا نیٹ ورک "مدارس" کا ہے۔ یہاں تو صورت حال اور بھی مایوس کن ہے۔ یہاں بھی صلاحیت کا فقدان ہے۔ اب آپ کو اچھے عربی اور فارسی جاننے والے مشکل سے ملیں گے۔ ڈگریوں کا حصول بنیادی مقصد بن کر رہ گیا ہے۔ نہ انہیں اسلامیات کا صحیح شعور ہو پاتا ہے اور نہ دوسرے مضامین کا۔ اور نہ ہی ان کی بہتر شخصیت اور کردار سازی میں یہ مدارس کوئی رول ادا کرپاتے ہیں۔ دوسرے ہم نے مدارس کے نصاب تعلیم کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ وہی پرانا نصاب جو صدی، نصف صدی پہلے تھا۔ آج بھی رائج ہے۔ ہم نے مدارس کے نصاب کو عصر حاضر کے نظام تعلیم سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عصری ضرورتوں اور تقاضوں کا ہمیں اب تک صحیح احساس نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامیات اور عربی فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی ووکیشنل اور ٹکنیکل تعلیم بھی نصاب میں داخل کی جائے اور اسے لازمی قرار دیا جائے۔ تاکہ وہ اس احساس کمتری سے نکل سکیں کہ مسجد کی امامت اور مدارس کی معلمی کے علاوہ بھی وہ اپنی آزادانہ تجارت اور مختلف شعبوں میں ملازمت کے اہل ہیں۔ ان اداروں کی انتظامیہ کا ایک تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کے ذریعے چندہ وصولی کا کام کراتے ہیں اور دوسرے جب کوئی انتقال کر جاتا ہے تو طلباء کی ایک فوج قل اور قرآن خوانی اور کھانے کے لئے جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت ہی کریہہ اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ ہم ابتدا ہی سے انہیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ خیرات پر پل رہے ہیں۔ اور ان کی خودداری اور انا کا ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انہیں جاگیر کہاں سے مل رہی ہے۔ کس ذرائع سے ان کی ضروت پوری ہورہی ہے یہ راز ان سے مخفی رہے۔ کیونکہ یہی ادارے کردار سازی کے بنیادی ادارے ہیں اور مستقبل میں انہیں ہی اخلاقیات اور اسلامیات کا درس دینا ہے۔

> **زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے. کمپیوٹر اور روبوٹ ہماری جگہ لے رہے ہیں. ایسے میں ہمیں وقت کی نبض کو پہچاننا ہے. عصر حاضر کے رائج الوقت سکے اور ٹکنالوجی کی طرف خصوصی توجہ دینی ہے اور خود کو ناگزیر بنا دینا ہے تاکہ کوئی ہمارا استحصال نہ کر سکے.**

(3) ہمیں اپنے بچوں کو اچھے اور معیاری اسکولوں میں داخلہ دلانا چاہئے اور ان کے لئے اچھے Tutor کی خدمات حاصل کرنی چاہئے ہمیں تعلیم کی اہمیت کا ابھی بھی صحیح احساس نہیں۔ والدین یہ سمجھتے ہیں کہ اسکولوں یا کالجوں میں داخلہ دلانے کے بعد ان کی ذمہ داریاں ختم ہوگئیں انہیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے بچے اسکول بھی جا رہے ہیں یا نہیں؟ ان کی صحبت کس طرح کے لڑکوں کے ساتھ ہے۔ اس پہلو پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جو والدین اس کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں وہ یا تو خود روزانہ تھوڑا وقت دیتے ہیں اور بچوں پر نظر رکھتے ہیں یا پھر کسی Tutor کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

(4) ہمارے یہاں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ اور جو تعلیم حاصل بھی کر رہی ہیں وہ سماجی مجبوریوں کی وجہ سے۔ کیونکہ شادی بیاہ کے موقع پر لڑکے تعلیم یافتہ لڑکیاں چاہتے ہیں اس لئے والدین مجبوراً انہیں تعلیم دلاتے ہیں وہ بھی ڈگری کے حصول تک، صلاحیت کا یہاں بھی فقدان ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے مستقبل کے معیار اور نئی نسل کو انہیں کی گود میں پروان چڑھنا ہے۔ اور ماں کا بچے کی تربیت میں زبردست رول ہوتا ہے اگر ماں تعلیم یافتہ ہے تو اس کا بہتر اثر بچے پر پڑتا ہے وہ بچے زیادہ مہذب اور Cultured ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت کی تعمیر تعلیم یافتہ ماں بہتر طور پر کرپاتی ہے۔ حالات تیزی سے کروٹ لے رہے ہیں ہمیں ان کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے جتنی ہم لڑکوں کی تعلیم پر دے رہے ہیں اور یہاں تعلیم کے حصول میں مقابلے کا ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں اپنی ملت کے اندر ہی سے باصلاحیت ٹیچر ڈاکٹر اور دوسرے شعبے میں خواتین مل سکیں۔

(5) جہاں ہمارے تعلیمی ادارے نہیں ہیں وہاں اچھے اور معیاری تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ تعلیم کی روشنی ہی ہماری تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ ابتدائی درجوں میں خاتون ٹیچر رکھی جائیں کیونکہ چھوٹے بچوں کو سختی سے زیادہ شفقت کی ضرورت ہے اور وہ اس فرض کو زیادہ خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہیں۔ مرد ٹیچر زیادہ دنوں تک ایک جگہ رہ بھی نہیں پاتے ہیں وہ بہتر مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور جیسے ہی موقع ملا وہ اسکول چھوڑ کر چل دیتے ہیں اس سے طلباء کا نقصان ہوتا ہے۔

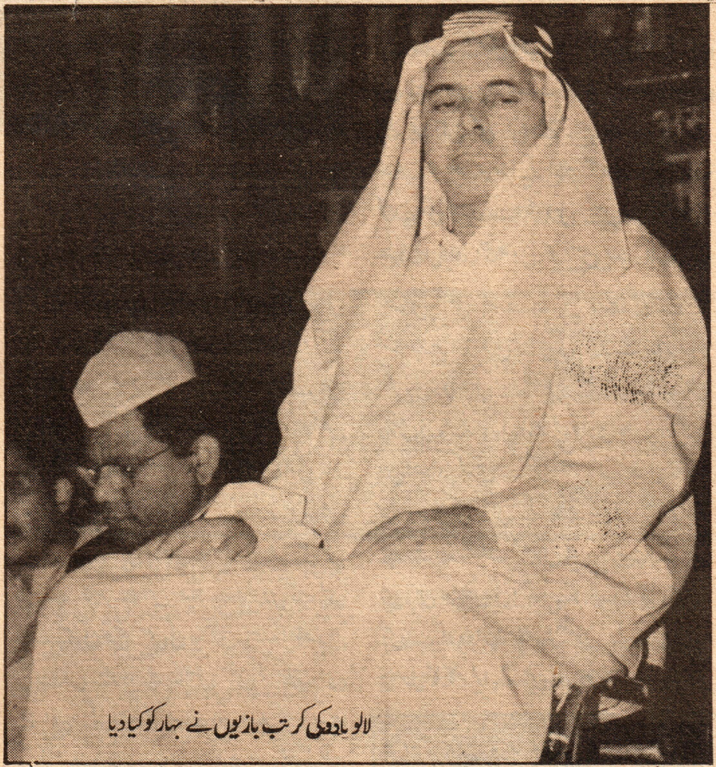
(6) اس مقصد کے حصول کا معاملہ کوئی آسان کام نہیں اس کے لئے تمام اداروں اور افراد کو سامنے آنا ہوگا۔ وہ ادارے جو مالی امداد فراہم کرتے ہیں انہیں فراخدلی کے ساتھ اچھے اور ذہین طالبعلموں کی مدد کرنی چاہئے اور ایسے صاحب خیر افراد اللہ نے جنہیں استطاعت دی ہے وہ بڑھ کر سامنے آئیں۔ انفرادی طور پر اپنے محلے اور ضلع کے ایسے ہونہار اور ذہین طلباء کی جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہے انہیں بہتر تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے میں تعاون دیں یا پھر ان اداروں کے ذریعے جو یہ کام کر رہے ہیں یہ ایک بہت بڑا کام ہے جس کو جہاد سمجھ کر کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں بھی اس کا بدلہ ملے گا۔ اور اللہ بھی آخرت میں اس کا اجر دے گا۔

●

جی ہاں! بہار میں سب خیریت ہے

آج کی سیاست میں ریلیوں کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ یوں تو ریلیاں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں پر ان دنوں بہار میں ریلیوں کا ایک ریلا سا آگیا ہے۔ کسان ریلی، ڈوم ریلی، چمار ریلی، کشواہا ریلی، بہار بچاؤ ریلی اور اب "غریب ریلی" ان ریلیوں کا اپنی طاقت کے بیجا اظہار اور نمائش اور اپنے مخالف کو دھونسانے کے حربے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ لالوجی نے پورے بہار کو ذات پات کے خانے میں بانٹ کر تو رکھ ہی دیا ہے اور پورے سماج کو بکھراؤ کے راستے پر لاکھڑا کیا ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لالوجی کی "غریب ریلی" پورے ہندوستان کی اب تک کی ریکارڈ توڑ ریلی ہے۔ بلکہ مبصرین کا کہنا ہے کہ 1974 میں جے پرکاش نرائن کو بھی سننے کے لئے اتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع نہیں ہوسکے تھے۔ ان کے شاگرد لالوجی ان سے بھی بازی لے گئے۔ گذشتہ 30 اکتوبر کو پٹنہ میں ایک ریلی اور ہوئی تھی اس میں بھی بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی اور ایک بڑا زبردست اجتماع ہوا تھا۔ یہ ریلی منعقد کرنے والے لوگ کبھی لالوجی کے اپنے قریبی دوست، ساتھی اور دست راست ہوا کرتے تھے۔ لالوجی کی سیاست کا سکہ جمانے اور چلانے میں ان لوگوں کا اہم رول تھا۔ اب وہ لوگ لالوجی کی ہٹ دھرمی، اڑیل رویے اور عامرانہ انداز برتاؤ سے برگشتہ ہو کر اب بہت دور ہوچکے ہیں۔ میری مراد جنتادل (جارج) سے ہے جسے اب سمتا پارٹی کا نام دے دیا گیا۔ اس ریلی نے لالو کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی۔ ہر طرف اس ریلی کے چرچے ہونے لگے اور سمتا پارٹی کی اقتدار کی طرف بڑھتے قدم کی بات کی جانے لگی۔ ویشالی پارلیامنٹری الکشن میں شکست اور جنتادل کی تقسیم سے وہ بہت ٹوٹ سے گئے تھے۔ اور اس ریلی نے مزید ان کی خود اعتمادی کو مجروح کیا۔ پارٹی اور حکومت پر گرفت ڈھیلی محسوس ہونے لگی۔ راج سنگھاسن ڈولتا نظر آیا۔ ایسی صورت میں لالو کے لئے ضروری ہوگیا کہ اپنی خود اعتمادی کو پھر سے بحال کیا جائے اور اپنی قوت کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا جائے کہ مخالفین کے حربے ناکام ہوجائیں۔ پھر کیا تھا پوری حکومت، پوری وزارت اور پوری سرکاری مشینری اس غریب ریلی کی تیاری میں جھونک دی گئی۔ وزراء کی کمیٹیاں بنیں، گاندھی میدان میں روزانہ وزراء کے دربار لگنے لگے۔ ہوا خواہوں اور خوشامدیوں کی بھیڑ جمع



لالو یادو کی کرتب بازیوں نے بہار کو کیا دیا

ہونے لگی۔ تمام ممبران پارلیامنٹ اور اسمبلی کے ذمے اپنے اپنے علاقے اور انتخابی حلقے سے بھیڑ اکٹھا کرنے کا کام سونپا گیا۔ علاقے میں چلنے والی تمام گاڑیوں، بسوں، ٹرکوں، ٹریکٹروں کو سیز کر کے لوگوں کو پٹنہ لایا گیا۔ اور واقعی پٹنہ کی سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا ایک ازدہام تھا۔ ایک سیلاب تھا۔ گاڑیوں کی پارکنگ کی جگہ تک نہیں رہ گئی تھی۔ لالو بھیڑ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور توقعات سے کئی گنا زیادہ لوگ جمع کر لئے گئے اور کامیاب کیسے نہیں ہوتے آخر پوری سرکار تو ان کے ہاتھ میں کھیل رہی تھی۔ لیکن ایک سوال بار بار ہمارے ذہنوں میں گونج رہا ہے اور کسک پیدا کر رہا ہے کہ یہ سب کچھ کس کی قیمت پر۔ کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے گئے کس کے خون پسینے کی کمائی پر۔ یہ ریلی اپنے اقتدار کے استحکام اور شان وشوکت کی نمائش کے لئے تھی یا غریبوں کے غم میں دبلے ہونے کے لئے۔ ان ریلیوں نے کب کس غریب کے پیٹ کی آگ بجھائی ہے جو یہ ریلی بجھائے گی۔ بلکہ اس ریلی نے تو بھوکے ننگے اور غریب عوام کا مضحکہ آڑایا ہے۔

لالو جی آپ زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بہار میں آج بھی لوگ زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ نہ تن ڈھاکنے کے لئے کپڑا ہے نہ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی۔ پینے کے پانی تک کی سہولتیں میسر نہیں، مکان کی بات تو بہت دور رہی۔ اور جہاں کے لوگ غیر انسانی زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ وہاں پر اپنے اقتدار کے لئے غریب عوام کا کروڑوں روپیہ غریب عوام کے نام پر غریبوں کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا یہ کروڑوں روپے ان غریب اور بے سہارا لوگوں کی بنیادی سہولتوں کے لئے خرچ نہیں کئے جاسکتے تھے۔؟

ریلی میں مقررین نے وی پی سنگھ، جیوتی بسو بیجو پٹنائک سے لے کر شرد یادو اور لالو پرساد نے وہی گھسی پٹی باتیں وہی پرانے ٹیپ دہرائے۔ سماجی انصاف کی دہائی دی گئی اور سماجی انقلاب کا نعرہ بلند کیا گیا۔ مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کی بات کی گئی۔ ذات پات کی سیاست کی مخالفت کی بات کہی گئی (جب کہ ذات پات کی سیاست ہی کی جارہی ہے) اور غریبوں کی لڑائی لڑنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا۔۔۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر لالو جی کو سکون نصیب ہوا اور ایک شان بے نیازی کے ساتھ فاتحانہ انداز میں مجمع پر نظر ڈالی اور سینہ تان کر فرعونی انداز میں فرمایا کہ میری لڑائی غریبوں، دلتوں، پچھڑوں اقلیتوں اور مسلمانوں کو عزت ووقار دلانے کے لئے ہے۔ انہیں غریب عوام کے کروڑوں روپیے کے خرچ کے لئے کچھ جواز تو فراہم کرنا ہی تھا۔

لیکن یہ باتیں کس حد تک درست ہیں اور ان دعووں میں کتنی سچائی ہے اور بہار کے عوام کے اندر ان نعروں میں کتنی کشش باقی رہ گئی ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ لیکن لالو اپنی حکومت کی ناکامیوں پر ان کرتب بازیوں کے ذریعے پردہ کب تک ڈالتے رہیں گے۔ کیا عوامی مقبولیت کا صحیح اندازہ ان کی جمع کی ہوئی بھیڑ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور کیا اس طرح کی کرتب بازیوں میں لوگوں کو زیادہ دنوں تک الجھائے رکھا جاسکتا ہے؟ سچی اور دیرپا مقبولیت عوامی خدمت اور فلاحی اور ترقیاتی کاموں کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور مقبولیت کا صحیح اندازہ کھیتوں، کھلیانوں اور گاؤوں میں رہنے والے لوگوں کی سوچ اور انداز فکر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے ان کے لئے کچھ کیا سماجی انصاف اور سماجی انقلاب نے ان کی زندگی میں کتنا انقلاب برپا کیا ہے۔ تو صورت حال بالکل برعکس نظر آتی ہے۔

> لالو کے دعووں میں کتنی سچائی اور ان کے نعروں میں کتنی کشش ہے یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ سوال یہ ہے کہ لالو اپنی ناکامیوں پر کرتب بازی کا پردہ کب تک ڈالتے رہیں گے۔ کیا عوامی مقبولیت کا صحیح اندازہ ان کی جمع کی ہوئی بھیڑ سے لگایا جا سکتا ہے۔

آج بہار کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوگئی ہے تعلیمی، معاشی شعبے میں روبہ انحطاط اور ایک بحرانی صورت حال سے بہار دوچار ہے۔۔۔ تعلیم کسی بھی قوم اور ملک کے تہذیب یافتہ ہونے کی نشانی بھی ہے اور اس کے ارتقاء کی بنیاد بھی۔ لیکن آج کی صورت حال یہ ہے کہ پورا تعلیمی نظام برباد ہوچکا ہے اور تباہی کے دہانے پر ہے۔ تعلیم کا کوئی معیار باقی نہیں رہا۔ کلاسوں کی روایت تقریبا ختم ہوچکی ہے۔ نقل نویسی عام ہے۔ اگر کسی وائس چانسلر نے تعلیمی نظام کو درست کرنے کی کوشش کی تو اسے اپنے عہدے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کیا لالو نااہلوں کی فوج جمع کر کے بہار کو روشن مستقبل دیں گے۔ کیا وہ ایک نیا بہار جاہلوں اور نااہلوں کے ذریعے بنانا چاہتے ہیں۔ کیا ان کا سماجی انقلاب یہی ہے۔ کیا یہ طلباء اپنے ملک اور صوبے کے لئے کوئی کارنامہ انجام دے سکیں گے۔ پورا بہار مالی بحران کا شکار ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ وملازمین اسکول ٹیچر مدارس کے اساتذہ کارپوریشن کے ملازمین تک کو دس دس ماہ تک تنخواہ نہیں ملنے کی وجہ سے فاقوں کی نوبت رہتی ہے۔ تمام ترقیاتی کام کاج ٹھپ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سڑکوں کی حالت خستہ ہے۔ بجلی کی پوزیشن بے حد خراب ہے پانی کی سپلائی بجلی کی وجہ سے بے حد چوپٹ ہے۔ روزگار کے مواقع دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں کاروبار کی حالت بھی روز بروز گرتی جارہی ہے۔ اب کاروباری اور تاجر بہار چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لالو جی کے بہار میں۔۔۔ جہاں "سماجی انقلاب" کا نعرہ بلند کیا جارہا ہے "غریب ریلی" ہو رہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ باقی سب خیریت ہے۔

●

بقیہ: تعلیم

مختلف سروسز کے مقابلہ جاتی امتحانوں کے لئے کم از کم ہر ضلع کی سطح پر ایک کوچنگ اور گائڈنس سنٹر کے قیام کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ ملت کے حساس باحوصلہ لوگوں کو سامنے آنا چاہیے اور اس کا فوری انتظام کرنا چاہیے۔

(7) الف: ہمیں Dropouts اور ایسے طالب علموں کے لئے جن کو اعلی تعلیم کے مواقع نہیں مل پاتے ہیں ووکیشنل اور ٹکنیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی ضرورت ہے جس میں انہیں ایسے Trade اور Courses کی ٹریننگ دی جائے جس سے وہ آزادانہ طور پر روزگار کر کے معاشی طور پر خود کفیل ہو سکیں مثلا Dropouts کے لئے الیکٹریشین، آرمیچر وائنڈنگ، فیٹر، کارپنٹر، اسکوٹر اور موٹر میکینک ٹریننگ وغیرہ وغیرہ۔ میٹرک سے گریجویشن کے لئے کمپیوٹر، ایرکنڈیشنگ ریفریجریشن، سکریٹریل پریکٹس وغیرہ پارا میڈیکل میں پیتھا لوجسٹ، ایکسرے ٹیکنیشین اور بہت سارے دوسرے کورسز ایسے ہیں جن کی ٹریننگ کے بعد وہ اپنی روزی روٹی کا مسئلہ باعزت طور پر حل کرسکتے ہیں اور ان کے معیار زندگی میں نمایاں تبدیلی آسکتی ہے۔

(ب) لڑکیوں کے لئے کرافٹ سنٹر کا قیام جس میں ٹیلرنگ، ایمبرائیڈری، فیبرک پینٹ، ٹکسٹائل پرنٹنگ انٹریر ڈیکوریشن وغیرہ کے کورسز ایسے ہیں جن کی ٹریننگ کے بعد گھر بیٹھے وہ معقول رقم کمانے کے قابل ہو سکتی ہیں اس طرح کے انسٹی ٹیوٹ ہر ضلع اور سب ڈویژن کی سطح پر قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

(8) ہماری ملت میں کافی بڑے اور صاحب ثروت لوگ موجود ہیں۔ انہیں چاہیے کہ منصوبہ بند طریقے سے بڑی بڑی انڈسٹریز قائم کریں اور اس میں ملت کے بے روزگار نوجوانوں کو روزگار مہیا کریں۔ اس طرح ہم تجارت میں بھی آگے بڑھیں گے اور ملت کے بے روزگار افراد کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔

(9) ہمیں بلاسودی بینک کے قیام کی طرف بھی خصوصیت سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں پورے ملک میں اسکا ایک نٹ ورک قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ غریب اور بے سہارا لوگوں کی مدد کر کے انہیں روزگار کے مواقع فراہم کر سکیں۔

(10) آج کی دنیا میں میڈیا کا بہت اہم رول ہے جھوٹ کو سچ کر دکھانا اس کا کمال ہے۔ ملکی ذرائع ابلاغ کا رول ہمارے سلسلے میں کبھی بھی مخلص نہیں رہا۔ ہمیشہ ہمارے خلاف اس کی سازشیں چلتی رہتی ہیں۔ ہمیں اس ذرائع ابلاغ کی بھی کاٹ کرنی ہے، غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے کی بھی تردید کرنی ہے۔

اس وقت ملک میں فرقہ پرستی کا جو زہر پھیلا دیا گیا ہے اسلام اور ہمارے خلاف نفرت کے جو بیج بودیے گئے ہیں اس میں چند سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ میڈیا کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ہماری تاریخ کو غلط طور پر مسخ کر کے پیش کیا جارہا ہے اور نئی نسل کے اذہان کو ہمارے خلاف ورغلایا اور پراگندہ کیا جارہا ہے۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں انبیائی امت کی حیثیت سے اپنے سبق کو پھر سے یاد کرنا ہوگا۔ اسلام کی صحیح اور سچی تصویر ان کے سامنے پیش کرنی ہوگی اور اس کا عملی نمونہ بن کر دکھانا ہوگا۔ دراصل ہم نے اپنا وہ سبق بھلا دیا ہے جو چودہ سو سال پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یاد کرایا تھا۔ ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اسلام نفرت نہیں سکھاتا۔ یہ دلوں کا بانٹتا نہیں ہے، جوڑتا ہے۔ یہ کسی نسل قوم یا مذہب کی بنیاد پر تفریق قائم نہیں کرتا۔ غلبہ اسلام کا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا جب تک ہم اسوہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرانہ ہوں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اہم اطلاع

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فیروز خان جو ملی ٹائمز کے اشتہارات کے سلسلے میں بمبئی کے دورے پر گئے اپنی غلط کارکردگی کی وجہ سے معطل کردئے گئے ہیں اب ان سے کسی بھی قسم کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ (فیروز خان عمر ساٹھ سال رنگ سانولا قد چھوٹا کسی حد تک سفید بال) نے اپنی ماضی کی غلط کاریوں سے تائب ہو کر رزق حلال کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا عہد کیا تھا اس لئے ہم نے انہیں ایک موقع دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ اپنی سابقہ روش پر لوٹ آئے۔ اور اس لئے ہم ان سے تعلق ختم کرنے پر مجبور ہوئے۔ اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے۔ (ادارہ)

کیا عورت اسلامی ریاست کی سربراہ بن سکتی ہے؟

شریعت کی روشنی میں مرد اور عورت کے مساوی حقوق کا جائزہ

اسلام میں خواتین کی حیثیت کے موضوع پر لوگوں میں خاصی غلط فہمی اور اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اسلام کے بدخواہ اسلامی آئین کے بعض پہلوؤں کو بغیر ان کے سیاق وسباق کے اچک لیتے ہیں اور عورتوں سے بے رحمانہ اور امتیازی سلوک کا الزام اس پر لگانے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب کہ ایسی کوئی بات حقیقت سے قریب نہیں ہے۔ اسلام نے ایسے وقت میں عورتوں کو مردوں کے برابر قرار دیا جب کسی فلسفے یا قوم کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ یہ بات بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

اسلام کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ اس مساوات کا اظہار تو سب سے پہلے یہیں ہو جاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو ایک خدا اور روز حساب پر ایمان رکھنا ہے۔ دونوں کو اپنے اچھے اعمال کی یکساں سزا ملے گی اور دونوں کو اپنے گناہوں کے لئے یکساں نوعیت کے عذاب وسزا سے گزرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شرع اسلامی میں مساوات بین الجنسین کی ضمانت دی گئی ہے۔ دونوں سے ایک ہی نوعیت اور یکساں عبادت بھی مطلوب ہے۔

بعض معاملات زندگی میں مرد وعورت کے مختلف کرداروں اور ان کی ذمہ داریوں کے پیش نظر اسلامی دستور میں بھی بعض امتیازات کو تسلیم کیا گیا ہے جن کا اطلاق حسب ضرورت مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے بعض لوگ ان معاملات کا بڑی باریک بینی سے صرف اس مقصد سے مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کی آڑ میں اسلام کو عورت مخالف روپ میں دنیا کے سامنے پیش کریں حالانکہ حقیقت برعکس ہے۔

اس سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ بعض مسلمان جن میں بزعم خود حامیان اسلام بھی شامل ہیں ایسے عناصر کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں اور اپنی تنگ نظری کی بنیاد پر یہ طے کر لیتے ہیں کہ اسلام عورت کو مرد کی محکوم مخلوق کا درجہ دیتا ہے۔ یہ حضرات ہمیشہ اس پر تیار نظر آتے ہیں کہ کب موقع ملے کہ اپنے خیال کی حمایت میں قرآن وحدیث کی

> ابن حزم کا خیال ہے کہ جو حکومت اقتدار اعلی سے محروم ہو جائے وہاں عورت کو اعلی ترین حکومتی منصب دیا جا سکتا ہے۔ ابن حزم کے ہم عصر شیخ محمد غزالی کے خیال میں ایسا نہیں ہے۔

آیت یا عبارت کا حوالہ پیش کر دیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے ان کے دئے گئے حوالوں میں نہ تو موزوں سیاق وسباق ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے اصل مفہوم تک ان کی رسائی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کو مردانہ غلبے کا معاشرہ قرار دے کر وہ اسلامی سماج کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ خیال شدید غلط فہمی پر مبنی ہے۔

عورت کے ہاتھ میں اسلامی ریاست کی قیادت پر اعتراض کے سلسلے میں عدالتی شہادتوں اور میراث کی مثالیں اکثر دی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان حضرات کے دعووں کی حقیقیت کا جائزہ لیا جائے۔ عورتوں کی گواہی کے بارے میں اسلام کے موقف کو لے لیجیے۔ قرآن میں تجارتی اور لین دین کے معاملات سے متعلق دستور وآئین میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ ان میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے تاکہ اگر ایک عورت کوئی بات بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا سکے۔ اس کی صاف وجہ یہ کہ خالق کائنات جس کو مرد وعورت دونوں کی طاقت وکمزوری معلوم ہے وہ ہمیں ایک ایسی بات بتاتا ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں نسبتا اس کا احتمال زیادہ ہے کہ وہ باتوں کو بھول جاتی ہوں۔ کیا اس کا مطلب عدم مساوات ہے یا کسی نزاعی صورت حال میں معتمد ترین شہادت کی ضمانت کی خواہش۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام تمام حالات میں عورتوں کی شہادت کو معتبر نہیں گردانتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بعض صورتوں میں صرف عورت کی ہی گواہی قابل قبول ہوتی ہے اور مخصوص حالات میں ایک عورت کی گواہی کافی ہے مثال کے طور پر ولادت کے فورا بعد فوت ہو جانے والے بچے کے معاملے میں صرف دائی ہی بتا سکتی ہے کہ نومولود کی چیخ سنی گئی تھی یا نہیں۔ اسی کی گواہی کی بنیاد پر زندہ اور مردہ حالت میں پیدائش میں امتیاز کیا جا سکتا ہے اس فیصلہ کا وراثت کے مسئلہ سے گہرا تعلق ہو سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کا منشا یہ ہے کہ اسلام کے دستور کی بنیاد مفروضات پر نہیں ہے بلکہ ایک عملی مذہب کی حیثیت سے وہ ہر معاملہ کے مثبت ومنفی پہلوؤں کا جائزہ لے کر ایسا دستور وضع کرتا ہے جس سے زیادہ سے زیادہ عملی اور مساویانہ شکل میں لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جا سکے۔

> تشویشناک بات یہ ہے کہ بعض مسلمان جن میں بزعم خود حامیان اسلام بھی شامل ہیں۔ ایسے عناصر کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں اور اپنی تنگ نظری کی بنیاد پر یہ طے کر لیتے ہیں کہ اسلام عورت کو مرد کی محکوم مخلوق کا درجہ دیتا ہے۔ یہ حضرات ہمیشہ اس پر تیار رہتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ اپنے خیال کی حمایت میں قرآن وحدیث کی آیت یا عبارت کو بطور حوالہ پیش کر دیں

ایک اور موضوع جس پر خاصی گرم بحثیں ہوتی ہیں وہ ہے عورت کی سیاست میں شرکت اور حکومتی عہدوں پر اس کے فائز ہونے کا۔ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ فارس کی موت اور اس کی بیٹی کے زمام حکومت سنبھالنے کی اطلاع پا کر فرمایا "جو قوم اپنے معاملات عورت کے ہاتھ میں دیدے وہ پھل پھول نہیں سکتی"۔ علماء نے اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ کسی اسلامی ملک میں عورت کو اعلی عہدے پر فائز ہونے سے روکا گیا ہے۔

ابن حزم کا خیال ہے کہ جو حکومت اقتدار اعلی سے محروم ہو جائے وہاں عورت کو اعلی ترین حکومتی منصب دیا جا سکتا ہے۔ ابن حزم کے ہمعصر شیخ محمد الغزالی کی دلیل یہ ہے کہ اس حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ شاہ فارس کی بیٹی نے جب اقتدار سنبھالا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ مخصوص طور پر فارس کی ریاست کی طرف تھا۔ الغزالی کا خیال مذکورہ حدیث کے براہ راست مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ اس خیال کی مزید توثیق قرآن میں مذکورہ ملکہ صبا کے واقعے سے ہوتی ہے اور یہ اشارہ کہیں بھی نہیں ملتا کہ ان کے اقتدار کی کسی زاویے سے مخالفت کی گئی ہو۔ اور نہ ہی قرآن میں اور نہ حدیث میں کہیں یہ آیا کہ اگر ان کی قوم کسی مرد کو اپنا اقتدار اعلی بناتی تو وہ زیادہ ترقی کرتی۔

فقہی مسائل

سوال وجواب کی روشنی میں

سوال: ایک خاتون نے بتایا کہ وہ بیمار ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کسی نجومی یا جیوتشی کے پاس گئیں جس نے ان سے کہا کہ ان پر سحر کا اثر ہے اور وہ اپنی جھاڑ پھونک سے ان کے مرض کا علاج کر دے گا۔ کیا نجومیوں، جیوتشیوں اور جھاڑ پھونک والوں کے پاس جانا ہمارے لئے گناہ ہے۔

جواب: رسول مقبول کا فرمان ہے کہ جس نے کسی کاہن سے رجوع کیا اور اس کی کہی ہوئی باتوں پر یقین کیا تو سمجھو اس نے رسول پر اللہ کی جانب سے نازل کی گئی باتوں سے انکار کیا اور ایسے عمل کا ارتکاب کیا جو کفر کے درجہ میں آتی ہے۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ اللہ عزوجل سے توبہ کرے اور اس طرح کے شعبدہ بازوں اور باطل کو رواج دینے والے مکاروں اور فریب کاروں کی بات کا ہرگز یقین نہ کریں جو کمزور اور بیمار دل والے لوگوں کو فتور میں مبتلا کرتے ہیں۔ اللہ سے توبہ کیجئے اور استغفار پڑھیے اور جان لیجئے اللہ ہی توبہ کو قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

نماز میں خیال کا بھٹکنا

سوال: میں عورت ہوں اور اللہ کی طرف سے فرض کردہ عبادات پر قائم ہوں لیکن نماز میں اکثر میں بھول کر ادھر ادھر کی باتیں سوچنے لگتی ہوں۔ خصوصا جب میں نماز کے لئے کھڑی ہوتی ہوں تو اسی وقت دن بھر کے واقعات میں سے بعض باتوں کی طرف رہ رہ کر دھیان جانے لگتا ہے اور دوران نماز بلند تلاوت کیے بغیر میں اس مشکل پر قابو پانے سے قاصر رہتی ہوں۔ آپ مجھے اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟

> بھنویں صاف کرنا اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی وتصرف کے مترادف ہے۔ ایسی کوئی تنبیہ تو نہیں آئی ہے کہ جس میں بھنویں اکھاڑنے اور مونڈنے کے درمیان تفریق کی گئی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ دونوں افعال کا نتیجہ ایک ہی ہے یعنی اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی کرنا۔

جواب: جو شکایت آپ کو ہے وہ اکثر نمازیوں کو رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کے دوران شیطان انسان کے دل پر وسوسوں کے دروازے کھول دیتا ہے تو بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن بہک جاتا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جان پاتا کہ وہ نماز میں اپنی زبان سے کیا پڑھ رہا ہے۔ اس بیماری کا علاج رسول اللہ نے تجویز فرمایا ہے کہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہتے ہوئے بائیں جانب تین بار تھوکا جائے۔ اس سے شیطانی وسوسوں کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو اس یقین کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالی کے روبرو پیش ہو رہا ہے، اور یہ کہ نماز میں اللہ کی عظمت وکبریائی بیان کر کے اور اس کے کلام کی تلاوت کے ذریعہ وہ اس کی قربت حاصل کر رہا ہے۔ لہذا جب انسان میں یہ شعور پیدا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ خشوع وتعظیم کے ذریعے وہ اللہ کے نزدیک ہو جاتا ہے بلکہ اچھی باتوں سے لگاؤ اور واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کی باز پرس کا خوف بھی پیدا ہوتا ہے۔

تعویذ گنڈا پہننا

سوال: تعویذ باندھنے یا پہننے اور تکیئے کے نیچے رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے یہ جاننے کے باوجود کہ ان تعویذوں میں قرآنی آیات لکھی ہوتی ہیں۔

جواب: سچ تو یہ ہے کہ تعویذ میں چاہے آیات قرآنی لکھی ہوئی ہوں یا احادیث نبوی ان کا پہننا حرام ہے کیوں کہ ایسا کوئی عمل رسول اللہ سے ثابت نہیں ہے تو جو بات آپ کے قول وعمل سے ثابت نہ ہو جس سے کہ اس کا جواز وسبب فراہم ہو تو وہ بے معنی ومہمل ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔ مسبب الاسباب تو اللہ عزوجل ہے۔ لہذا تعویذ کو سبب تصور کر لینا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ تعویذ خواہ قرآنی آیت والا ہو یا کسی اور چیز کا دونوں صورتوں میں حرام ہے جب انسان کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہو تو اسے چاہیے کہ ایسے شخص کی مدد لے جو قرآن کی تلاوت کر کے اس پر دم کرے جیسے کہ حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دم کیا کرتے تھے اور آپ اپنے صحابہ کرام پر دم کیا کرتے تھے۔ اس حد تک ضرور جائز ہے۔

بھنویں صاف کرنا

سوال: شوہر کی پسند پر آرائش کی غرض سے بھنویں صاف کرنے کے سلسلے میں کیا حکم ہے۔ واضح رہے کہ میری مراد بھنوؤں کو مونڈنے سے ہے اکھاڑنے یا نوچنے سے نہیں۔

جواب: اس فعل کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جاتا۔ بھنویں صاف کرنا اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی وتصرف کے مترادف ہے اور رسول اللہ نے شدت سے تنبیہ فرمائی ہے۔ ایسی کوئی تنبیہ تو نہیں آئی ہے کہ جس میں بھویں اکھاڑنے اور مونڈنے کے درمیان تفریق کی گئی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ دونوں افعال کا نتیجہ ایک ہی ہے یعنی اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی کرنا۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بھوؤں کو مونڈنا ان کے اکھاڑنے کی ہی طرح ممنوع ہے۔ ہاں اگر بھنوؤں کے بال اتنے لمبے ہو جائیں کہ آنکھوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوں یا بد ہیئتی کا سبب بنیں تو اس صورت میں زائد بالوں کو کترنے میں میرے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں۔

کیا آپ ذہنی تناؤ اور جسمانی تشنج کے شکار ہیں؟

آج کی دنیا میں انسانیت، جن مسائل سے دو چار ہے ان میں تفکرات اور ذہنی تناؤ بھی سر فہرست ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تناؤ میں صرف وہی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو حد سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنہیں کوئی کام نہیں رہتا اور ہر وقت عیش و آرام سے پڑے رہتے ہیں انہیں زیادہ تناؤ کی شکایت ہوتی ہو۔ بعض حالات میں تناؤ اور فکر مندی کسی فرد کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ جس کی بناء پر وہ چھوٹی چھوٹی پریشانیوں پر بھی پریشان ہو ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے اور بہتری کی طرف سے ناامید ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد کو ہمہ وقت ایسا لگتا ہے کہ ان کا وجود ختم ہونے والا ہے اور یہاں تک کہ ان کے آس پاس کے افراد بھی اسی کیفیت سے دو چار ہیں۔ گویا کہ ان کا ذہن کسی وقت بھی تناؤ سے خالی نہیں رہتا۔

اگر چہ ذہنی تشنج کے شکار لوگ جن تجربات سے گذرتے ہیں ان کی نوعیت یکساں ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اسباب مختلف لوگوں اور حالات کی صورت میں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اسباب اعصابی ہو سکتے ہیں اور دماغی بھی۔

جسمانی سطح پر زیادہ محنت اور خصوصاً جب کسی کو پہلے سے اس کی عادت نہ ہو اعصابی تناؤ پیدا کرتی ہے۔ مناسب آرام اور نیند سے اس پریشانی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ عضلات جس قدر کمزور ہوں گے اسی قدر عضلاتی نظام کے تشنج سے متاثر ہونے کا خطرہ لاحق رہے گا۔ چونکہ ہر شخص کو بعض حالات میں ضرورت سے زیادہ کام اور محنت کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ ایسے مرحلے سے بخوبی گذرنے کے لئے عضلاتی نظام کو مضبوط حالت میں رکھنا چاہئے۔ اس طرح ہنگامی حالات میں اضافی کام انجام دینے کی صلاحیت جسم کے اندر محفوظ رہے گی۔ موزوں غذائیت اور پابندی کے ساتھ ورزش کے ذریعے عضلاتی نظام کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔

تشنج کا دوسرا سبب اعصابی کمزوری ہے۔ اعصابی رگوں کا ڈھانچہ کمزور ہے تو زیادہ آسانی سے تشنج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جسمانی سطح پر اعصاب کی ساخت کو پوری طرح توانا حالات میں رکھا جائے۔ اعصابی کمزوری جتنی زیادہ ہوگی داخلی اور بیرونی دونوں نوعیت کی محنت میں کمی لانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اگر کام کی زیادتی پر قابو نہ پایا جائے اور غیر قوت بخش غذا کا استعمال جاری رہے تو کمزور رگیں اور بھی کمزور پڑ جاتی ہیں۔ کمزور رگوں والے شخص کو زیادہ تر سبزی اور پھل پر گذارہ کرنا چاہئے وہ بھی اس طرح کہ کچھ مقدار تو کچی حالت میں ہی استعمال کی جائے اور باقی کو بغیر مسالے کے ہلکا سا پکا لیا جائے۔

کھاتے وقت کھانے کو اچھی طرح چبانا چاہئے اور اس کے ساتھ اس کی کوالٹی پر بھی خصوصی توجہ دی جائے۔ کمزور رگ والوں کو چاہئے کہ اسٹارچ اور چکنائی سے بھری چیزوں سے پرہیز کریں، خصوصاً غیر قوت بخش غذاؤں سے جو عام صحت مند افراد کے لئے بھی حد درجہ مضر ہیں۔ اس لئے اعصابی کمزوری سے متاثر افراد کو کہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے انہیں ایسی غذا کے قریب بھی نہیں جانا چاہئے۔ غذا میں اصلاح کرنے کے ساتھ یہ بھی ضرورت ہے کہ کھلی ہوا میں اور پھیلی چمکتی ہوئی دھوپ میں کچھ وقت ہلکی ورزش بھی صحت پر دیرپا اثر چھوڑے گی۔ یہ بات یاد رہے کہ مسکن دواؤں کا استعمال اس حالت میں کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مرحلہ بہت بعد میں آتا ہے کہ ایسی چیزوں کا سہارا لیا جائے یا نہیں اس لئے کہ ان سے صرف وقتی سکون ملتا ہے۔ جذباتی غیر ہم آہنگی بھی دماغی تشنج کا سبب بن سکتی ہے۔ جذباتی طور پر منتشر شخص کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے دوست احباب اور بہی خواہ اسے اپنے گرد و پیش اور ماحول سے حقیقت پسندانہ انداز میں ہم آہنگی پر آمادہ کریں اور اس بات کی اہمیت کا اسے احساس دلائیں۔ جذباتی تصادم اور لوگوں کے تئیں غلط فہمیاں پیدا کرنے والی ہر صورت حال سے گریز کرنا چاہئے۔ بلکہ زیادہ اچھا تو یہ ہوگا کہ متاثر فرد میں پوری ہمدردی اور شفقت کے ساتھ یہ احساس بیدار کیا جائے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں اور احباب کے تئیں اپنے رویے میں تبدیلی لائے۔ اس طرح ایک نئے رابطے کے قیام میں ایسے شخص کی مدد کی جانی چاہئے۔

جن خاندانوں کے افراد ایک جگہ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت محتاط رہنے کا رویہ اختیار کرتے ہیں اس سے ایک سرد جنگ جیسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور آپس میں فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ بھی تشنج کا سبب بنتا ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اگر خاندان کے افراد کے درمیان اختلاف رائے ہے بھی تو اس میں بجائے غلط فہمی، بغض یا نفرت کو ہوا دینے کے ہر شخص کو چاہئے کہ دوسرے کے خیالات کو کھلے دل سے سنے اور اس پر غور کرے۔

> **ایسے افراد کو ہمہ وقت یہ لگتا ہے کہ ان کا وجود ختم ہونے والا ہے اور یہاں تک کہ ان کے آس پاس کے افراد بھی اسی کیفیت سے دو چار ہیں۔ گویا کہ ان کا ذہن کسی وقت بھی تناؤ سے خالی نہیں ہے۔**

لوگوں کے تئیں حد درجہ قانونی یا میکانیکی رویہ بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر چہ اس سے نظم و ضبط میں دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس کا انجام عموماً تلخی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں کے اصلاح کی توقع سے وہ ایسا رویہ اپناتے ہیں ان کی اصلاح ہو نہیں پاتی اور الٹا خود وہ ہی احساس ناکامی کے ہاتھوں ذہنی تناؤ کا عارضہ لگا لیتے ہیں۔

ذہنی تناؤ کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کے کام پر پسندیدگی کا اظہار کیا جائے۔ شہروں میں رہنے والے زیادہ تر لوگ جسمانی محنت کے ہر کام کو عموماً ناپسند کرتے ہیں۔ یہ رجحان بذات خود جسم کو سست اور اعصاب کو کمزور کرتا ہے۔ جسمانی محنت کے فقدان سے دوران خون میں سستی واقع ہوتی ہے اور یہ بھی تشنج کا پیش خیمہ ہے۔ جسمانی ورزش زندگی کی بنیادی ضرورت ہے جو صحت اور شخصیت دونوں کی تعمیر و بقاء میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

کام کے تئیں تعمیری رجحان کا فقدان بھی اکثر و بیشتر روز مرہ معمولات کو بے رس اور دلچسپی سے عاری کر دیتا ہے۔ اگر تعمیری مقصد کی اہمیت کے احساس کے ساتھ کام کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے بلکہ طمانیت کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اس طرح انجام پذیر ہونے والے سبھی کام فرد کی شخصیت کو فروغ دیتے ہیں اور اس کے لئے اور مجموعی حیثیت سے پورے سماج کے لئے اس کی افادیت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ ذہنی تناؤ کام کے تصور یا اس کی زیادتی سے اتنا نہیں بڑھتا جتنا اسے قید با مشقت سمجھنے سے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کوئی شخص خود کو ہلکان کرنے کی حد تک محنت یا کام کرے۔ کام ہی کی طرح آرام اور تفریح بھی بہت ضروری ہیں۔ جس کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔

●●●

آپ کے دانتوں میں فلورائڈ تو نہیں؟

اپنے دانتوں کو بیماری سے بچایئے اور پرکشش بنئے

راجیو گاندھی ڈرنکنگ واٹر مشن کے شعبۂ فلوریسس کے ایک سروے سے پتہ چلا ہے کہ ملک کے پندرہ صوبوں میں جن میں اتر پردیش، راجستھان، گجرات، آندھرا اور تمل ناڈو سر فہرست ہیں جہاں کے 50 سے 100 فیصد اضلاع فلوریسس سے متاثر ہیں۔

پنجاب، ہریانہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک کے 50 فیصد اضلاع اور دہلی، جموں و کشمیر اور اڑیسہ و کیرالا کے 30 فیصد اضلاع بھی اسی مرض کے شکار ہیں۔

آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں واقع اس شعبے سے وابستہ ماہرین کا خیال ہے کہ باقی صوبوں میں بھی یہ بیماری پینے کے پانی کے ذریعے جلد یا بدیر پھیل سکتی ہے۔ اس دوران وبائی امراض سے متعلق سروے نگاروں اور صحت عامہ کے افسران کی طرف سے گھر گھر جا کر کی گئی معلومات سے یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ وہاں کی 75 فیصد آبادی کسی نہ کسی قسم کے فلوریسس میں مبتلا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 150 اضلاع میں آباد 25 سے 30 ملین افراد مختلف نوعیتوں کے فلوریسس سے متاثر ہیں اور اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ تقریباً پوری آبادی دیہی طرز کی زندگی گزارتی ہے جہاں پینے کے لئے صاف پانی میسر نہیں ہوتا اور اس میں فلورائڈ کی آمیزش ہوتی ہے۔

مذکورہ شعبے کا کہنا ہے کہ پالیسی سازوں، پیشہ ور ماہرین صحت عامہ کے انجینیروں اور غیر سرکاری تنظیموں کو اس مرض کے خطرات سے آگاہ کر دیا گیا ہے لیکن ان کی خاطر خواہ توجہ ابھی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ایسی مہم چلانے کی ضرورت ہے کہ میونسپل کارپوریشن کے علاوہ دیگر ذرائع سے حاصل کردہ پینے کے پانی میں فلورائڈ کی مقدار کو جانچ لیا جائے۔ فلورائڈ پیٹ میں جانے کی صورت میں بھوک غائب ہونے، قے، متلی، پیٹ میں مروڑ اور قبض کی شکایات پیدا ہو سکتی ہیں۔ جو حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں فلورائڈ ملا ہوا پانی استعمال کرتی ہیں ان کے بچوں کو فلوریسس کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

> **فلورائڈ پیٹ میں جانے کی صورت میں متلی، پیٹ میں مروڑ اور قبض کی شکایات پیدا ہو سکتی ہیں۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین فلورائڈ ملا ہوا پانی استعمال کریں تو بچوں کو فلوریسس کا مرض لاحق ہو جاتا ہے...**

شعبۂ فلوریسس کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں اس مرض کی شناخت اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ممکن ہے۔ ذمہ داران کے مطابق جب فلوریسس سے متاثر افراد کو صاف اور بہتر پینے کا پانی کچھ دن استعمال کرایا گیا تو آنتوں کی سوزش اور پیٹ کی بیماریوں کے آثار زائل ہونے لگے۔ کیمیائی جانچ سے یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ فلورائڈ کی آمیزش والے پانی کے استعمال سے اعصابی کمزوری، قلت خون اور شریانوں میں دوران خون کی رکاوٹ کے عوارض بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ گجرات، جموں و کشمیر، اتر پردیش اور مدھیہ پردیش کے اضلاع میں ٹیوب ویل، کھلے کنوؤں، ہینڈ پمپوں اور دیگر وسائل سے جمع کردہ پانی کے نمونوں کے کیمیائی تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان میں فلورائڈ کی آمیزش 03. سے 2 پی پی ایم ہے۔ ہریانہ کے گڑگانوں ضلع میں فلورائڈ کی یہ مقدار 38.5 پی پی ایم ہے جو پورے ملک میں ہر جگہ کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ مقامی باشندوں نے ماہرین کو بتایا کہ وہاں کے پانی میں چاول پکاتے ہیں تو اس کا رنگ پیلا ہو جاتا ہے اور دودھ جب چائے میں ڈالتے ہیں تو وہ پھٹ جاتا ہے۔ گڑگانوں ضلع کے 85729 افراد جن کا طبی معائنہ کیا گیا ان میں 7770 افراد دانتوں، ہڈیوں اور آنتوں کے مرض میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ اسی طرح فرید آباد کے سماہا پور گاؤں میں 56.6 فی صد لوگ ہڈیوں کے، 65.9 لوگ دانتوں کے اور 52.4 لوگ آنتوں کے امراض کے شکار پائے گئے۔

اس مسئلہ کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ پانی کے نمونوں کے کیمیائی تجزیے سے اس پرانے خیال کی تردید ہو گئی ہے کہ محفوظ اور آلودہ وسائل آب ایک ہی جگہ پر پائے جاتے ہیں۔ یعنی کہ پانی کے تمام ذرائع کی الگ الگ جانچ کی جانی چاہئے۔

باقی صـ۱۳ پر

پوپ جان پال کی نظر میں دوسرے مذاہب کمتر اور ناپسندیدہ ہیں

۳۵ ممالک سے بیک وقت شائع ہونے والی پوپ جان پال دوم کی کتاب کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں دو رائے نہیں کہ پوپ جان پال ثانی رومن کیتھولک چرچ کی قیادت کا گہرا جذبہ اور شوق رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں ضرور شک ہے کہ وہ فنکارانہ زبان میں پوری بصیرت اور ذہنی عمق کے ساتھ کوئی کتاب لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کی 227 صفحات پر مشتمل کتاب "کراسنگ دی تھرشولڈ آف ہوپ" کو کتاب کہنا مبالغہ آرائی ہوگی۔ اس کی حقیقت بھان متی کے کنبے جیسی ہی ہے۔ جو کچھ انہوں نے اس کتاب میں کہا ہے وہ ایک تحریری مجموعہ سوالات کا جواب ہے جو ویٹریو مسوری نے ان کے سامنے رکھے تھے۔ ویٹریو مسوری ویٹکن میں مقیم اطالوی صحافی ہیں۔ انہوں نے مذکورہ سوال نامہ پوپ کی خدمت میں ایک ٹی وی انٹرویو کی تمہید کے طور پر پیش کیا تھا۔ موصوف ٹیلی ویژن کیمرے کے سامنے بیٹھنے کا وقت جب نکال نہ سکے تو انہیں یہ کتاب لکھنے کی سوجھ گئی جو بذات خود ایک ایسی مکالماتی نشست کی حیثیت بھی رکھتی ہے جس میں سوال کرنے والے پر جذبہ عقیدت واحترام کا حد درجہ غلبہ ہے۔

ان کے بعض جوابات قاری کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ ایسے سوالات پڑھنے والوں کے ذہن میں ضرور ابھریں گے کہ یہ کتاب کس کے لئے لکھی گئی ہے اور دینیات، مسیحی تعلیمات اور ذاتی یادداشت تینوں پر بیک وقت بنی گہرے احساس سے مربوط دلچسپ اور تعجب خیز مشاہدات نے کتابی شکل اختیار کر کے حد درجہ مقبولیت کیسے حاصل کرلی۔ حال ہی میں یہ کتاب ایک ساتھ 35 ممالک میں شائع ہوئی ہے۔ کتب خانوں میں اس کی ساڑھے بارہ لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اور صرف امریکہ میں اس کے حقوق طباعت سے نو ملین ڈالر کی آمدنی ہوئی ہے۔ اور اس سے یہ پہلے طے ہو چکا تھا

> مسلمانوں، یہودیوں اور یہاں تک کہ پروٹسٹنٹ عیسایوں کا خیال ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد آزادانہ مکالمے اور گفت وشنید کے لئے پوپ کی دعوت عام پر کھوکھلے نعرے کا گمان ہوتا ہے۔

کہ سرجری سے صحت یابی کے منتظر 74 سالہ پوپ نے اپنا شمالی امریکہ کا دورہ منسوخ کیا ورنہ یہ دورہ اور کتاب کی اشاعت دونوں میں مطابقت ہوجاتی۔

مسوری کے سوالات ازلی مسیحی اصول وضوابط اور تازہ ترین اختلافات سے بحث کرتے ہیں جن میں حضرت عیسی مسیح کی روحانیت سے لے کر اسقاط حمل تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کئی ماہ تک اپنے خالی اوقات میں ان مسائل کا انتخاب اور ان پر غور کرنے کے بعد پوپ نے اپنا مسودہ جب مسوری کے سپرد کیا تو اس میں حسب منشا تصرفات کرنے کا مجاز بھی انہیں بنا دیا۔

سپردم بہ تو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم وبیش را

حالانکہ اس کتاب کے ناشر کا دعوی ہے کہ پوپ کا روئے سخن تمام مذاہب کے معتقدین کی طرف ہے لیکن مسلمانوں، یہودیوں اور یہاں تک کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے عیسائیوں کا خیال ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد آزادانہ مکالمے اور گفت وشنید کے لئے پوپ کی دعوت عام پر کھوکھلے نعرے کا گمان ہوتا ہے۔ انہوں نے دیگر مذاہب کو کمتر قرار دیتے ہوئے کچھ اس طرح کے فیصلے دیئے ہیں کہ بدھ مت کے عقیدت مند منفی روایت کے پیرو ہیں اور اس عقیدے کو زیادہ سے زیادہ ایک جمالیاتی نظام کہا جاسکتا ہے یا یہ کہ اسلام دین نجات نہیں ہے۔ صلیب اور روز حشر کی کوئی گنجائش وجواز نہیں ہے۔ اور حضرت عیسی کا ذکر (آسمانی کتابوں میں) صرف پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہے۔ اس سوال کا جواب سن کر عقیدت مندوں کے دل شاید بیٹھ جائیں کہ مشفق خدا نے خود اپنے بیٹے کو قربان کیوں کر دیا۔ اس بارے میں پوپ نے کہا کہ "اس کے لئے پہلے ہمیں دیکارٹ کے بعد یوروپی فکر وفلسفہ کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے" ان کا مدعا یہ ہے کہ یہ سوال بذات خود برگشتہ عقلیت کی پیداوار ہے اور جیسا کہ انیسویں صدی کے معروف مفکر کارڈنیل نیومین نے لکھا ہے کہ "لوگوں سے بحث کرنا اتنا ہی لغو کام

> پوپ جان پال کہتے ہیں کہ بدھ مت کے عقیدت مند منفی روایت کے پیرو ہیں۔ اسلام دین نجات نہیں ہے اور صلیب اور روز حشر کی کوئی گنجائش اور جواز نہیں ہے۔ نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ کلیسا جائیں اور یسوع مسیح کا جلوہ دیکھیں۔

ہے جتنا کہ انہیں کسی بات پر ایمان لانے کے لئے ایذا دینا"

ایسا لگتا ہے کہ مسوری نے پوپ کی اطاعت کا عہد کر رکھا ہے کہ اس لئے انہوں نے ان سے یہ بھونڈا سوال بھی کیا ہے کہ مقدس خدا کے دل میں نوجوان لوگوں کے لئے مخصوص جگہ ہے۔ اور اسی لئے جا بجا کہتا ہے کہ پورا کلیسا ایک نئی امید کے ساتھ مسیحی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ تو کیا واقعی اس کی امید ہے۔ اس مشکل سوال کے جواب میں پوپ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ "یہ سوال کر کے آپ نے بحث اور غور وخوض کا پورا میدان فراہم کر دیا ہے" یہ میدان یقینا اتنا وسیع ہے کہ پاپائے محترم کا دماغ اس میں ٹکریں مار مار کر کہیں صحائف کا حوالہ دے رہا ہے اور کہیں حکایات سے مثالیں پیش کر رہا ہے اور آخرش زچ ہو کر انہیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ "نوجوانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کلیسا کو جائیں اور کلیسا میں یسوع مسیح کا جلوہ دیکھیں" یہ الفاظ وخیالات خواہ کتنے ہی سنجیدہ ہوں انہیں ادب کے کسی خانے میں نہیں رکھا جاسکتا اور روحانی تاثر اور ادبی معیار کے اعتبار سے تیسویں پوپ جان لی جرنل آف اے سول" جیسے قدیم شہکار کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔ مختصرا یہ کہ اس کتاب نے ان کے وقار وتقدس کو ارزاں کر دیا ہے۔

Crossing the Threshold of Hope By
His Holiness John Paul II
244 Pages Knopf $ 20

شام فرانس کے پنجہ استبداد سے آزادی کی کھلی فضا تک

سلمیٰ مردم بے کی کتاب شام کی جدوجہد آزادی پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے

اگرچہ شام کی جدید تاریخ پر اب تک متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر زیر تبصرہ کتاب کو یہ خصوصی اہمیت اور امتیاز حاصل ہے کہ اس کی مصنفہ شام کی ایک مشہور سیاسی شخصیت کی صاحبزادی ہیں۔ بظاہر یہ کتاب جدید شام کی تاریخ کے کسی ایسے پہلو پر روشنی نہیں ڈالتی جو پہلے تاریکی میں رہے ہوں، لیکن بعض تشنہ پہلوؤں کے بارے میں مزید اور واضح تفصیلات فراہم کرتی ہے جو بذات خود بہت اہم ہے۔

ادھر کچھ سالوں سے شام کی جدید تاریخ میں لوگوں کی دلچسپی بڑھی ہے کیونکہ بعض بالکل نئے ماخذ اور دستاویز سامنے آئے ہیں۔ سلمی مردم بے کی کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سلمی نے اس کتاب میں اپنے والد جمیل مرحوم کے ذاتی کاغذات کی مدد سے شام کے قومی رہنماؤں کے فرانس اور برطانیہ سے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ جمیل بے کے ذاتی کاغذات ان اسباب وحالات اور مذاکرات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جن کی بدولت شام کو 1945 میں آزادی نصیب ہوئی۔

شام کی آزادی کی جدوجہد میں جمیل مردم بے کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 1911 میں کیا جب پیرس میں انہوں نے عثمانی ترکوں کی مخالفت پر مبنی ایک خفیہ عرب جماعت کی رکنیت اختیار کی جنگ عظیم اول میں عثمانی ترکوں کی شکست کے بعد اور شام کے فرانس کے قبضے میں آنے سے قبل شریف حسین کے بیٹے فیصل کی سربراہی میں 1920 میں جو آزاد شامی حکومت تھوڑے وقفے کے لئے قائم ہوئی تھی جمیل اسمین نائب وزیر خارجہ تھے۔ جب شام فرانس کے زیر انتداب آیا تو انہوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لئے فرانسیسی حکمرانوں سے

> شام کی جدوجہد آزادی میں جمیل مردم بے کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے فرانسیسی حکمرانوں سے بھرپور گفت وشنید کی۔ وہ حکومت میں مختلف وزارتوں پر فائز رہے اور آزادی کے وقت وہ وزیر خارجہ اور قائم مقام وزیر اعظم بھی تھے۔ ان کی بیٹی کی یہ کتاب جدید شام کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوگی۔

مذاکرات میں اہم رول ادا کیا۔ 1945 میں ملک کی آزادی کے وقت جمیل وزیر خارجہ اور قائم مقام وزیر اعظم تھے۔ 1946 میں وہ دوبارہ شام کے وزیر اعظم بنے لیکن دو برس بعد اس عہدے سے استعفا دے دیا اور ملک چھوڑ کر مصر چلے گئے۔ اس کے بعد وطن کی سیاست سے وہ عملا علیحدہ رہے مگر پھر بھی وہاں کے حالات سے باخبر رہتے اور بڑے معروضی انداز میں ان کا تجزیہ کرتے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ 1954 میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ 1960 میں وہ اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئے۔

سلمی مردم بے نے اپنے والد کے ذاتی کاغذات کے علاوہ ایک اہم برطانوی شخصیت سر ایڈورڈ اسپیئرس کے ذاتی کاغذات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے فرانسیسی وبرطانوی وزارت خارجہ کی بعض دستاویزوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کاغذات اور دستاویزوں کی مدد سے سلمی نے اس وقت کے شام فرانس کے تعلقات کے نشیب وفراز پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان تعلقات پر دوسرے تاریخ نویسوں نے بھی روشنی ڈالی ہے مگر جمیل مردم کے کاغذات اس وقت کے حالات پر شامی نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرنے کے ساتھ مذاکرات کے دوران مختلف پارٹیوں نے جو حکمت عملی اختیار کی اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرح شام کی جدید تاریخ پر موجود مواد میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

ایک قومی لیڈر کی صاحبزادی ہونے کے ناطے سلمی نے فطری طور پر شامی قومیت سے کافی اثر لیا ہے اور ان کی پوری کتاب میں ایک قومی نقطہ رواں دواں نظر آتا ہے۔ وہ بڑے طمطراق سے یہ دعوی کرتی ہیں کہ "خارجی حکومت کے زیر اقتدار رہنے والی دوسری قوموں کے لئے شام ایک حوصلہ مندانہ نمونہ تھا" وہ اپنے والد کی اس شکایت کی حمایت کرتی ہیں کہ ڈی گال اور جنرل بینٹ ہمیشہ تصادم چاہتے رہے جب کہ اس کے برعکس شام کے قومی رہنما ہر قیمت پر ٹکراؤ سے بچنا چاہتے تھے۔ وہ بعض برطانوی تاریخ نویسوں کے اس خیال کی تنقید کرتی ہیں کہ فرانس کو شام سے نکالنے کا کریڈٹ لندن کو جاتا ہے۔ سلمی کے مطابق برطانوی خارجہ پالیسی اس وقت بالکل غیر واضح تھی بلاشبہ ایڈورڈ اسپیرس فرانس کے مخالف تھے مگر چرچل نے انہیں کبھی آزادی سے کام نہیں کرنے دیا۔ اگرچہ چرچل نے اسپیرس کی اس بات پر سرزنش کی کہ وہ شام کے بہت زیادہ حامی اور فرانس کے شدید مخالف ہیں۔

اس کے علاوہ سلمی یہ دعوی بھی کرتی ہیں کہ اس وقت برطانیہ بہت زیادہ امریکہ کے زیر اثر آگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دمشق پر فرانسیسی چڑھائی کو روکنے سے پہلے وہ امریکہ کی اجازت کا طلب گار تھا۔

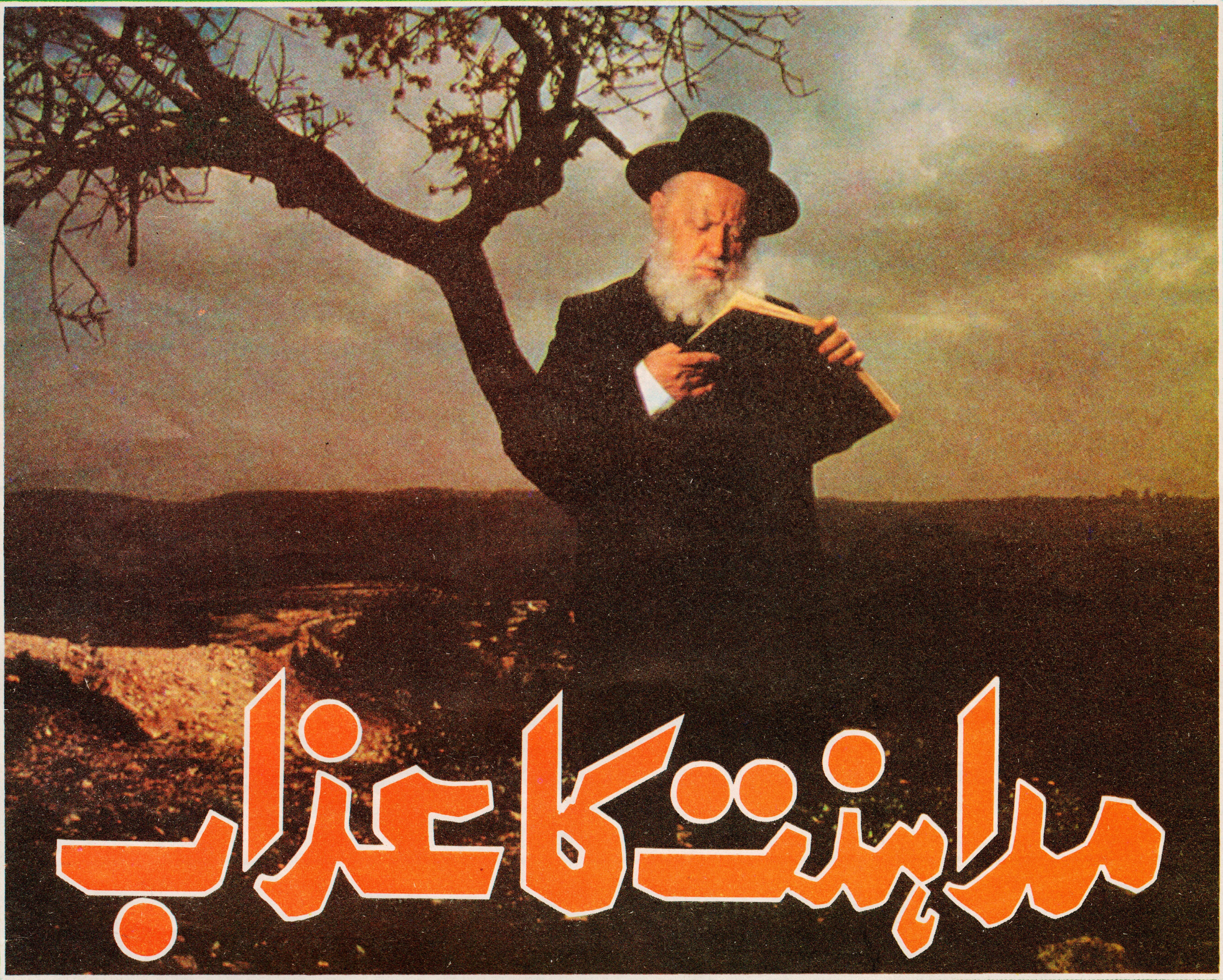
جیسا کہ اوپر ذکر ہوا سلمی کی کتاب شام کی جدید تاریخ کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالتی ہے۔ اس طرح اس موضوع پر موجود لٹریچر میں یہ ایک قیمتی اضافہ ہے، لیکن یہ کتاب صرف 1945 تک کے حالات سے متعلق ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سلمی اپنے والد کے ذاتی کاغذات کی مدد سے 1945 کے بعد شام میں رونما ہونے والے حالات پر بھی کوئی تصنیف منظر عام پر لائیں گی جس سے نہ صرف یہ پتہ چلے گا کہ ان کے والد نے آزادی کے فورا بعد کیا رول ادا کیا بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ کس طرح نوخیز شام نے اس وقت کے کشیدہ بین الاقوامی حالات میں اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لئے جدوجہد کی۔

Syria's Quest for Independence1939 1945
by Salma Mardam Bey
Garnet Publishing, Reading, England, 1914.
Price -£30

Invitation Price Rs. 3/-
1 - 15 December, 1994

The Milli Times International
(India's first International Urdu Weekly)
49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-16036/94



مداہنت کا عذاب

یہودی عالم ابراہیم شاپیرو کو کھلے آسمان کے نیچے مقدس کتاب کے مطالعے کا بڑا شوق ہے۔ انھیں توریت کی ورق گردانی کرنے اور دن رات آسمانی حوالے سے گفتگو کرنے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ بالعموم سیاہ سوٹ اور سیاہ یہودی ٹوپی میں ملبوس یہودیوں کا کوئی گروہ اگر آپ کو کہیں دیکھنے کو مل جائے، خواہ یہ لندن کی یہودی آبادی کے علاقے ہوں یا نیویارک کی یہودی بستی میں، آپ سمجھ لیجئے کہ یہ سب کے سب مذہبی یہودی ہیں۔ یقیناً اہل یہود میں مذہبی شعائر کا پاس بظاہر بہت واضح نظر آتا ہے کہ سروں سے چپکی ہوئی چھوٹی گول ٹوپی ان کی مذہبی اور ملی شناخت کا جز ہے۔ شمال ہو یا جنوب، مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ وہ اپنی اسی شناخت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر کی اس تزئین کے باوجود جو چیز نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ان کے اندرون خوف خدا سے یکسر خالی ہیں۔ یقیناً ان میں بعض خدا ترس بھی موجود ہیں لیکن نہ تو کوئی مؤثر حیثیت حاصل ہے اور نہ ہی خود ان کے اندر راہ عزیمت کی کوئی طلب پائی جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کتنا سچ ہے کہ علماء یہود مچھر چھانتے ہیں اور اونٹ نگل جاتے ہیں۔

سلطنت اسرائیل میں علمائے یہود کی ایک کثیر تعداد کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ سلطنت کے اندر ہونے والے مظالم پر ان کی زبان نہیں کھلتی۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ حکومت نے فلسطینیوں کے خلاف گزشتہ نصف صدی میں کس درجے کا ظلم و بربریت روا رکھا ہوا ہے۔ وہ آسمانی احکام کی نفی ہے۔ وہ توریت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ لیکن مداہنت جو علماء یہود کا شیوہ ٹھہرا انہیں حق گوئی سے روکتی ہے۔

چند سال پہلے پروفیسر لیب وچ جنہیں یہودی دنیا کا مفکر اعظم ہونے کا شرف حاصل ہے، نے اسرائیلی حکومت کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ اسرائیلی معاشرہ توریت کی تعلیم کی نفی کر رہا ہے۔ اس کے نوجوان آوارہ اور جنسی بے راہ روی کے شکار ہیں۔ ظلم عام ہے فلسطینی نوجوانوں کی ہڈیاں توڑ کر انہیں اپاہج بنا دینا توریت کی تعلیم کے عین منافی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسرائیلی حکومت کا ظلم و ستم یوں ہی جاری رہا تو پورا اسرائیل ایک عقوبت گاہ میں تبدیل ہو جائے گا اور یہ عقوبت گاہ صرف فلسطینی نوجوانوں کے لئے نہیں بلکہ مجھ جیسے خدا ترس یہودی کے لئے بھی ہوگی کہ میں اپنے لئے سلطنت اسرائیل میں کوئی مقام محسوس نہیں کرتا۔ لیکن پروفیسر لیب وچ جیسے خدا ترس آخر کتنے ہیں، پھر خدا کے عذاب سے اہل یہود کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ جب کسی قوم کے علماء حق کو حق کہنا چھوڑ دیتے ہیں تو پوری قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ اہل یہود کے حوالے سے قرآن بار بار اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لیکن رسوائی کا یہ عذاب جو اہل یہود کو تاریخ میں بار بار پیش آتا رہا ہے صرف ان کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں بار بار دنیا میں قتل و غارتگری کے سیلاب سے گزرنا پڑا، ذلت ان کا مقدر بن گئی۔ یہاں تک کہ اس صدی کے پہلے نصف میں صرف جرمنی میں ساٹھ لاکھ یہودی قتل کر ڈالے گئے۔ آج یہودیوں سے کہیں زیادہ بے بسی امت مسلمہ پر طاری ہے پوری دنیا میں ان کا خون بہ رہا ہے۔ ذلت اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ اس کا سبب بھی انہیں اصولوں کی روشنی میں تلاش کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ علماء اسلام بھی اس وقت اسی مداہنت کے شکار ہیں جو کبھی اہل یہود کا شیوہ رہا ہے۔ حق گوئی بے باکی اگر آج بھی علماء اسلام کا شیوہ بن جائے اور قائدین ملت مصلحت بینی سے اوپر اٹھ کر کلمہ حق بلند کر سکیں تو اسلام کے عالمی غلبے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان